نصر من اللہ وفتح قریب

ہفت روزہ

نصرت

لاہور

۲۲

اتوار ۲۳ فروری ۱۹۶۹ء

ذوالفقار علی بھٹو ←

اے فخرِ قوم، قوم کی تقدیر بن کے آ
اے ذوالفقار فاتح کشمیر بن کے آ
— علی ولی میسر

مدیر: محمد حنیف رامے

۳۰ پیسے

پڑھنے والے لکھتے ہیں

بٹائی ناجائز ہے

حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے راولپنڈی کی پریس کانفرنس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے فتویٰ کا حوالہ دیا تھا کہ بٹائی پر زمین کاشت کرانا ناجائز ہے۔ اس پر سامراج پرست اور سرمایہ داری وجاگیرداری کے "مذہبی پشت پناہ" اس قدر بوکھلا اٹھے کہ ان کے سرکاری آرگن "آئین" نے ۲۹ جنوری ۶۹ء کے شمارے میں بعض مفتیانِ کرام کے حوالے کے ساتھ سرے سے اس فتویٰ کا ہی انکار کر دیا ہے۔ ان مفتیانِ کرام اور ان کو استعمال کرنے والے سامراجی ایجنٹوں کی اطلاع کے لیے گذارش ہے کہ حضور والا! غصہ تھوکیے اور سامراجیت کی سیاہ اور تاریک عینک اُتار کر درج ذیل کتب میں "باب المزارعۃ" کا مطالعہ فرمائیے۔

(۱) ہدایہ (۲) کنز الدقائق (۳) قدوری (۴) المبسوط للسرخسیؒ (۵) المرقاۃ المنقاری (۶) بدائع الصنائع (۷) المحلی لابن حزمؒ (۸) سراجیہ (۹) قاضی خان (۱۰) نیل الاوطار (۱۱) بحر الرائق (۱۲) بزل المجہود (۱۳) انوار المحمود (۱۴) عالمگیری۔

ان کتب میں آپ کو نہ صرف امام اعظمؒ بلکہ اسلاف میں سے عکرمہؒ، مجاہدؒ، عطاءؒ، ابن سیرینؒ، محمد بن القاسمؒ، حسن بصریؒ، شعبیؒ، زفرؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور ابن حزمؒ جیسے جلیل القدر ائمہ کرام کے ارشادات بھی بٹائی کے عدم جواز پر نظر آجائیں گے۔ (رشید الحیدری ناظم نشریات جمعیۃ علماء اسلام۔ گوجرانوالہ)

بھٹو صاحب رحیم یار خاں میں

۱۱ فروری کو میں اپنے ایک عزیز کو الوداع کہنے رحیم یار خاں کے ریلوے سٹیشن پر گیا مگر ٹرین (کراچی ایکسپریس) لیٹ تھی۔ اسی دن خیبر میل بھی لیٹ تھی۔ وقت گزارنے کے خیال سے میں اور میرا عزیز پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد رحیم یار خاں کے اے۔ ڈی۔ ایم۔ ڈی۔ ایس۔ پی اور پولیس کے کچھ دیگر افسران وغیرہ بھی سٹیشن پر آن پہنچے۔ ان کی موجودگی بلاشبہ سٹیشن پر موجود لوگوں کے لیے حیران کن تھی۔ اسی دوران خیبر میل بیرونی سگنل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جونہی ٹرین سٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم سے ایک نوجوان جس نے سات رنگ کی اُون کا سویٹر اور اس کے اُوپر بھاری دار پُل اوور پہنا ہوا تھا، نیز ماتھے پر پٹی بھی باندھی ہوئی تھی، با[illegible] صاحب آگئے، بھٹو صاحب آگئے" کہتا ہوا انجن کی جانب دوڑا۔ جونہی گاڑی رُکی وہ نوجوان ایک ڈبے کے سامنے رُک گیا۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اس کے پیچھے آکر رُک گئے۔ نوجوان نے "بھٹو صاحب زندہ باد" کا نعرہ لگا کر ڈبے کی کھڑکی کو زور سے بجایا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ہمارا محبوب لیڈر — عوامی آرزوؤں کا مرکز — ذوالفقار علی بھٹو ہمارے سامنے موجود تھا۔ بے تاب ہجوم اسی نوجوان کی قیادت میں بھٹو صاحب "زندہ باد" اور "ایوب حکومت مُردہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔ نعرے بھی لگ رہے تھے اور لوگ بے تابانہ آگے بڑھ کر جناب بھٹو سے ہاتھ بھی ملا رہے تھے۔ اسی دوران نوجوان نے تیزی سے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور قائداعظم کی تصویر والا پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بھٹو صاحب کو دستخطوں کے لیے پیش کیا۔

بھٹو صاحب اچانک اس نوجوان کی جانب مڑے اور اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کی جانب اشارہ کر کے پریشانی والے لہجے میں پوچھا: "یہ آپ کو کیا ہوا" قبل اس کے کہ وہ نوجوان کچھ اور کہتا ایک اور شخص بولا: "لاٹھی چارج سے"۔ بھٹو صاحب غصّے کی حالت میں اپنے عقب میں کھڑے ہوئے پولیس آفیسر کی جانب مڑے اور کہا: "تم تو کہتے ہو ہم کچھ نہیں کر رہے! یہ کیا ہے" اب دوبارہ بھٹو صاحب اس نوجوان کی جانب مُڑے اور یوں باتیں کرنے لگے گویا پہلے سے ان کی واقفیت ہو۔ اسی دوران نوجوان نے بھٹو صاحب سے کہا کہ لوگ پیپلز پارٹی کی معیشت یعنی سوشلزم کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں، براہِ کرم آپ یہاں پر موجود لوگوں کی تسلی کرا دیں۔ اس کے جواب میں جناب بھٹو نے جو الفاظ کہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ انھوں نے فرمایا: "ہم پہلے مسلمان ہیں پھر پاکستانی ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ۔ باقی رہا سوشلزم کا اسلام کے خلاف ہونا تو ایسا پروپیگنڈا حکومت اور سامراجی ایجنٹ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر انھیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں"۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گاڑی نے وسل دی اور فلک شگاف نعروں کی گونج میں مسٹر بھٹو ہم سے جُدا ہوئے۔

(سلیم احمد قریشی، قریشی جنرل سٹور۔ صادق بازار۔ رحیم یار خان)

مظلوم کی فریاد

دل چاہتا تھا کہ آپ کی کچھ عملی مدد کر سکوں مگر اس ایک قطعے سے زیادہ اپنے بس میں کچھ بھی تو نہیں۔

درسِ عبرت ہے فقط تاریخ میں ان کا وجود
تھے کبھی اس دہر میں نمرود بھی، شداد بھی
یہ مزاجِ ظلم کی ہے آخری حدِ کمال
جُرم بن جاتی ہے جب مظلوم کی فریاد بھی

(محمد رضا سرشار۔ سمن آباد۔ لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

گول میز پر نہیں، گول باغ میں فیصلہ ہوگا

عوام کے حقوق پر سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی عوام کے حقوق چھین لے تو ان کی بازیابی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ عوام اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں نہ کہ اس سے ان کی بھیک مانگیں۔ مراعات مانگنے والی سیاست کا جواز انگریز کی رخصتی سے بھی قبل ختم ہو گیا تھا۔ عوام نے پاکستان مانگا نہیں تھا، اس کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس مطالبے کو برسوں کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے گرم خون سے تقویت دی تھی۔ پاکستان ہمیں کسی گول میز پر نہیں ملا تھا، پاکستان ہم نے منٹو پارک میں حاصل کیا تھا، پلٹن میدان میں حاصل کیا تھا، موچی گیٹ میں حاصل کیا تھا جب عوام گلیوں میں نکل آتے ہیں، جب طالب علم سروں پہ کفن باندھ لیتے ہیں، جب خواتین اپنے آنچلوں سے پرچم بنا لیتی ہیں تو پاکستان بن جاتا ہے۔ آج بھی اگر ہم نے مساوات کی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو یہ کامیابی گول میز پر نہیں گول باغ میں حاصل ہوگی۔ اور عوام نے اپنے لہو کے چراغوں سے اس کامیابی کا راستہ منور کر دیا ہے۔

جس نے عوام کے حقوق غصب کیے ہوں اُسے اگر پتا چل جائے کہ لوگوں نے اُسے پہچان لیا ہے تو وہ کتنے دن لاٹھی اور گولی کے بل بوتے پر ان حقوق کو اپنی مٹھی میں بھینچے رہے گا۔ جب کسی ملک کے عوام اپنے حقوق کے لیے گھروں سے نکل آتے ہیں تو پھر بڑے بڑے سامراج گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، پھر کوئی مٹھی ایسی نہیں رہتی جو کھل نہ جائے، کوئی غاصب ایسا نہیں رہتا جو مسروقہ مال اُگل نہ دے۔ یہ کہاں کا دستور ہے کہ چھینے ہوئے حقوق یوں لوٹائے جائیں جیسے کوئی حاتم اپنی ذاتی جائیداد خیرات کر رہا ہو اور ضرورت مند اس کے دروازے پر منڈلا رہے ہوں۔

حقوق عوام کے ہیں، جدوجہد عوام کی ہے، حقوق عوام کو لوٹائے جانے چاہئیں۔ آخر وہ کون سے نازک نکتے ہیں جو گول میزوں کے بغیر سمجھ میں نہیں آ رہے۔ کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جمہوریت نہیں ہونی چاہیے۔ کیا بالغ رائے دہی اور خود مختار اسمبلیاں شجرِ ممنوعہ ہیں، کیا اس مملکت خداداد کے باشندوں کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت نہیں ہونی چاہیے۔ کیا یہاں شہری آزادیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ کیا یہاں پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی ننس اور پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ آسمانی صحیفے ہیں کہ رد نہیں کیے جا سکتے۔ کیا اس سرزمین کے باشندوں پر تعلیم اور فوجی تربیت حرام ہے۔ کیا یہاں کے محنت کشوں کو روٹی کپڑا اور مکان نہیں چاہیے۔ کیا یہاں کے مزدور کو احتجاج کا حق نہیں، کیا یہاں کے کسان کو زمین نہیں چاہیے۔ کیا یہاں کی درسگاہوں کی مجوسی اور مسجدوں کی بے حرمتی ضروری ہے۔ کیا ہمارے بیماروں کو دوائی نہیں چاہیے، جدوجہد میں شہید اور مجروح ہونے والوں کو معاوضہ نہیں چاہیے۔ پسماندہ علاقوں کی ترقی غیر ضروری ہے۔ طلباء پر تشدد کے بغیر کام نہیں چلتا اور ان کا عوامی مسائل سے پرہیز لازم ہے؟ کیا یہ ملک ایک زندہ معاشرے کے بجائے کوئی شہرِ خموشاں ہے؟ کیا یہ ملک کسی کی ذاتی جاگیر ہے یا یہ جاگیر چند لوگوں کو پٹے پر ملی ہوئی ہے کہ عوام کو ایک طرف رکھ کر اس کی برکتوں کو آپس میں تقسیم کر لیں۔

نہیں، یہ ملک عوام کی جدوجہد سے وجود میں آیا ہے، یہ ملک اس ملک کے عوام کا ہے، اور عوام ہی طاقت کے مالک ہیں۔ کوئی شخص واحد، کوئی سیاسی جماعت، خواہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی ہو، عوام سے بالا بالا اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ یہ حق صرف اور صرف عوام کا ہے کہ وہ بنیادی مسائل پر اپنی آزادانہ رائے سے فیصلہ دیں۔ عوام سے آئینی دفعات کی اطاعت کا صرف اسی وقت مطالبہ کیا جا سکتا ہے جب آئین کی تشکیل میں عوام نے حصہ لیا ہو اور اسے اپنی تائید سے نوازا ہو جس طرح کسی فردِ واحد کو یہ حق نہیں کہ وہ کوئی آئین گھڑ کر عوام پر مسلط کر دے بالکل اسی طرح کسی سیاسی جماعت یا سیاسی جماعتوں کے کسی مجموعے کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی گول میز پر بیٹھ کر آئینی تبدیلیاں کرے اور انھیں عوام کا مقدر بنا دے۔ عوام کی عدالت گول باغ اور پلٹن میدان میں سجی ہوئی ہے، ملک کے قریے قریے میں سجی ہوئی ہے۔ عوام کی قسمت کا فیصلہ اس ملک گیر عوامی عدالت میں ہوگا۔

جو لوگ بات چیت، مذاکرات اور مکالمے کے اس قدر شائق ہیں وہ عوام سے بات چیت کیوں نہیں کرتے، ان سے مذاکرات کی طرح کیوں نہیں ڈالتے، ان سے مکالمے کا رشتہ کیوں نہیں جوڑتے۔ کیا عوام کوئی اچھوت ہیں، کوئی نیچ مخلوق ہیں۔ جو لوگ آج مذاکرات کی دعوت حاصل کر کے اتنے مسرور نظر آتے ہیں انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انھیں یہ مسرت عوام کی لہو آلود جدوجہد نے بخشی ہے، ورنہ اس سے قبل انھیں بھی اچھوت اور نیچ مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ چلیے وہ مذاکرات کا شوق پورا کر لیں، آخر جن لوگوں سے وہ مذاکرات کرنے گئے ہیں وہ ان کے ہم خیال اور ہم مشرب ہیں اور ان کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن انھیں علم ہونا چاہیے کہ کمرۂ ملاقات کے باہر بارہ کروڑ عوام کی ان پر کڑی نظر ہے اور جن سیاسی رہنماؤں پر عوام کو اعتبار ہے کہ وہ بھی باہر عوام کی صفوں میں کھڑے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اہلِ مذاکرہ باہر تشریف لائیں تو وہ عوام کے دکھوں اور محرومیوں کا کوئی ٹھوس مداوا ساتھ لائیں، نہ کہ وہ چند چھنے ہوئے حقوق جن پر بات چیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو اسی طرح خدا کی دین ہیں جس طرح یہ زندگی۔

محمد حنیف رامے

حالاتِ حاضرہ — حسین نقی

لاہور میں بیر فیڈریشن کا جلوس

سودے بازی کی بساط
——— اُلٹ دی گئی

قوم نے ایک بار پھر اقتدار میں شامل اور اقتدار سے باہر حکمران طبقات کے دھوکے میں آنے سے انکار کر دیا ہے۔ مقتدر عوامی رہنماؤں نے جن میں پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور نیشنل عوامی پارٹی کے بظاہر ضعیف لیکن جوان فکر قائد مولانا بھاشانی سرِفہرست ہیں ـــ سودے بازی کی بساط اُلٹ دی ہے اور برسرِ اقتدار اور اقتدار میں حصّہ بٹانے کے لیے بے قرار افراد کو قوم کی قسمت کا سودا کرنے سے محروم کر دیا ہے۔ ان دو رہنماؤں نے اپنے عہد آفریں فیصلے سے عوامی تحریک کو اصل مقاصد سے ہٹانے کی سازش میں مصروف ایوانوں میں کھلبلی مچا دی ہے۔

مسٹر بھٹو نے عدالتِ عالیہ سے اپنی رٹ درخواست واپس لیتے ہوئے جو وجوہات بیان کی تھیں ان میں واضح کر دیا تھا کہ اس وقت کی جانے والی "مصالحت"، منافقت، فریب اور کھلی کھلی غداری ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ "تاریخ کے سامنے کیے ہوئے پیمان کو پورا کریں گے"۔ الحمدللہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

اپنی جانب سے انہوں نے ہر کوشش کی کہ "جمہوری مجلسِ عمل" میں شامل جماعتیں برسرِ اقتدار گروہ کے دباؤ میں آنے کے بجائے عوامی تحریک کا ساتھ دیں اور حزبِ اختلاف کو تفریق سے بچانے کی سرکاری سازش کے پھندے میں نہ آئیں، لیکن افسوس کہ "جمہوری مجلسِ عمل" اقتدار میں حصّہ بٹانے اور مراعات حاصل کرنے کی خواہش کو دبانے میں ناکام ہوگئی۔ اور عوامی خواہشات کے برخلاف اس حکومت کے نمائندوں سے مذاکرات کرنے پر رضامند ہوگئی جس کو وہ ابھی تک ہفتہ پہلے تک کسی کا بھی نمائندہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

اگر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کے حالیہ بیان پر اعتبار کیا جا سکے تو "جمہوری مجلسِ عمل" کے مذاکرات میں شامل ہونے کا سبب ملک میں مارشل لاء لگنے کا خطرہ بنتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے اس سلسلے میں حزبِ اختلاف کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ اسے دھونس، دباؤ اور دھمکی کا نشانہ نہیں بننا چاہیئے بلکہ موجودہ تحریک کو جرأت اور پامردی سے اس کی منزل سے ہم کنار کرنا چاہیئے۔ مولانا بھاشانی نے بھی واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ عوامی مسائل بات چیت سے نہیں جد و جہد سے

لاہور میں بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں خواتین (پیپلز پارٹی) کا زبردست جلوس

ملے ہوں گے۔ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا کہ حکمران ٹولے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ موجودہ عوامی تحریک کے زور کو توڑ دے۔

مذاکرات میں شامل ہونے کے لیے صدر کا دعوت نامہ نامنظور کرتے ہوئے مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی نے ان حالات کا تذکرہ کیا ہے جو اس وقت ملک کو درپیش ہیں۔ انہوں نے اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ عوام پر تشدد کا دور دورہ ہے۔ بہت سے سیاسی قیدی جو ہنگامی حالات کے خاتمے پر رہا کیے گئے تھے دوبارہ نظر بند کیے جا رہے ہیں۔ سیاسی اور طالب علم کارکن جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ پولیس کے تشدد کا شکار ہونے والوں کے ورثاء کو اب تک خوں بہا نہیں دیا گیا ہے۔ مسجدوں میں پولیس کے داخلہ سے جو بے حرمتی ہوئی ہے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں نہیں آئی مطابعلوں کے مطالبات تشنۂ تکمیل ہیں۔ پریس پر پابندیاں بدستور جاری ہیں۔ بہت سارے شہروں میں کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ پولیس پُرامن اور نہتے عوام پر تو گولیاں اور ڈنڈے برسا رہی ہے لیکن سرکاری سرپرستی میں غنڈہ عناصر گولیاں چلاتے اور چاقو مارتے پھر رہے ہیں اور "قانون کا ہاتھ" ان کے گریبانوں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ سرکاری زمینیں ابھی تک غیر کسانوں کے ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں اور مزدور حق ہڑتال سے محروم ہیں۔

مولانا بھاشانی نے کہا ہے کہ حکومت کو نوشتۂ دیوار پڑھنا چاہیئے اور مسٹر بھٹو نے تو حکومت کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ انہوں نے عوام کی موجودہ جدوجہد کی سیدھے سادھے الفاظ میں ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ عوام تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ تبدیلی بہتری کے لیے ہونی چاہیئے اور اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والا نیا نظام ایسا ہونا چاہیئے جو بدعنوانیوں، رشوت ستانی، سماجی اور اقتصادی ناانصافیوں کی لعنتوں سے پاک ہو، ایسے نظام کا محض ظاہری دکھ رکھاؤ ہی جمہوری نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کی بنیادیں ـــــ معاشی و معاشرتی ادارے ـــــ بھی جمہوری ہونے چاہئیں۔ مسٹر بھٹو نے موجودہ فضا کو بہتر بنانے کے لیے دس تجاویز پیش کی ہیں اور مولانا بھاشانی نے مشرقی پاکستان کے طلباء کی جانب سے پیش کردہ گیارہ نکات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ گیارہ نکات نیشنل عوامی پارٹی کے چودہ نکات کو پورا کرتے ہیں۔

مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی کے علاوہ آزاد سیاستدانوں یعنی ایئر مارشل اصغر خاں، لفٹننٹ جنرل اعظم خاں اور سید محبوب مرشد نے بھی مذاکرات میں شامل ہونے سے بڑی حد تک اس بنا پر انکار کر دیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایک آزاد فرد کی طرح کانفرنس میں شریک نہیں ہو رہے اور اگرتلہ سازش کیس تاحال واپس نہیں لیا گیا۔ ان حضرات نے پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہوں یعنی مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی کی شرکت پر بھی زور دیا ہے۔ چھ نکات کی حامی عوامی لیگ نے بھی اپنے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کی غیر موجودگی میں مذاکرات میں شرکت سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ شیخ مجیب اگرتلہ سازش کیس کی موجودگی میں ایک مجرم کی حیثیت سے کسی قسم کے مذاکرات میں شامل ہونے پر تیار نہیں۔

جہلم میں بیگم نصرت بھٹو کے شاندار استقبال کا ایک منظر

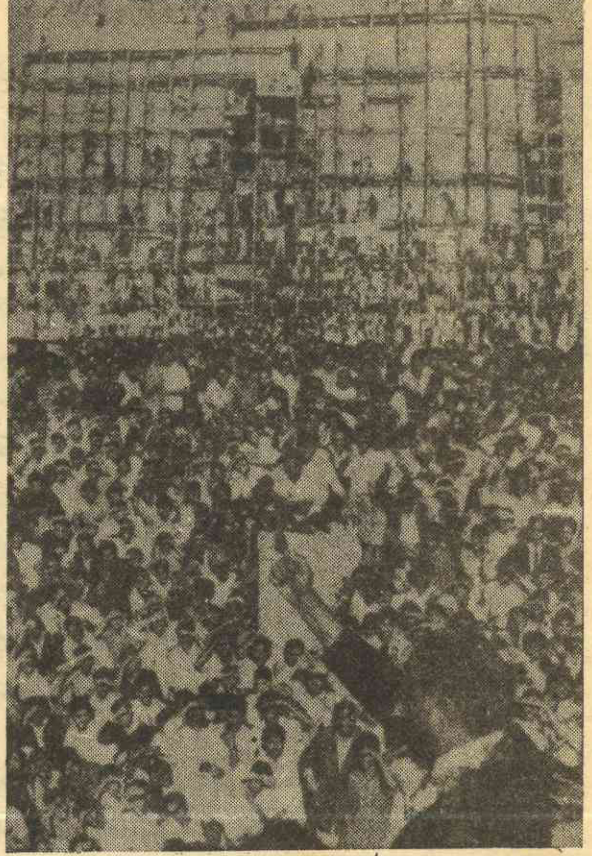

چیئرمین بھٹو قائد اعظم کے مزار پر

امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی نے حکومت اور "جمہوری مجلس عمل" کے مذاکرات شروع ہونے سے قبل اپنی جماعت کے ارکان سے خطاب کے دوران سوالات کے جواب میں کہا کہ اگر موجودہ "اشتعال انگیز" صورت حال زیادہ عرصہ برقرار رہی تو خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں اور ان نتائج میں یہ بھی عین ممکن ہے کہ صدر ایوب فوجی ہائی کمان کو ملک میں مارشل لاء کے نفاذ پر آمادہ کرلیں۔"

مولانا کا یہ بیان ساری قوم کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اولاً تو مولانا نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ موجودہ تحریک میں اشتعال انگیزی کا جز کب اور کس نے داخل کیا ہے۔ اگر ان کے سابقہ بیانات کو نظر میں رکھا جائے تو مولانا مودودی اور ان کی جماعت اور ان کے علاوہ جمہوری مجلس عمل کے سربراہ نواب زادہ نصر اللہ اور بعض دیگر لیڈر عوام کے "ایک حلقے" پر شرپسندی کا الزام بھی تھوپ چکے ہیں۔ ان دونوں بیانات کو ملا کر پڑھنے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی اور دائیں بازو کے بعض دوسرے لیڈر عوامی جدوجہد کی شدت سے خوفزدہ ہو کر اب عوام کو مارشل لاء کے "ہوّے" سے ڈرانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک صدر ایوب کا تعلق ہے وہ سابقہ "مارشل لا" کے خالق رہ چکے ہیں اور اس مارشل لاء کے نتیجے میں جو کچھ ہوا ہے اس سے کوئی ذی ہوش بے خبر نہیں ہے۔ مولانا مودودی کا یہ باور کرنا کہ موجودہ صورت حال کے نتیجے میں یہ عین ممکن ہے کہ صدر ایوب فوج کی ہائی کمان کو مارشل لاء لگانے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بپھری ہوئی قوم کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ "مجلس عمل" نے مذاکرات میں شرکت کر کے قوم کے ساتھ غداری کے بجائے بڑا احسان کیا ہے۔ اور قوم کو آئندہ دس سال تک کے لیے آمریت سے بچا لیا ہے۔ اولاً تو مولانا مودودی اور ان کی قبیل کے لوگوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ اس ملک کے عوام غیر عوامی جمہوریت اور شخصی آمریت دونوں کا تجربہ کر چکے ہیں اور اب وہ اس قسم کے کسی دھکے سلے کو برداشت نہیں کریں گے۔ اگر مولانا مودودی، ان کے حواری اور ہمنوا عوام پر بھروسہ رکھتے تو اس قسم کی بزدلی کا ثبوت نہ دیتے اور موجودہ تحریک کو دھونس اور دھاندلی کے تحت دبائے جانے کے خلاف اسی طرح سے آواز اٹھاتے جس طرح مغربی پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نے اٹھائی ہے۔ پھر انھیں اس ملک کے طالب علموں پر بھی، جو موجودہ تحریک کے ہراول دستہ اور ہیرو ہیں، بھروسا کرنا چاہیے تھا جنھوں نے اب تک تشدد کی ہر دھمکی کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور جان کی قربانی تک سے دریغ نہیں کیا۔

مولانا مودودی نے مارشل لاء کے خطرے کا اظہار کر کے پاکستانی افواج کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساری قوم اس بات پر متفق ہے کہ پاکستانی فوج کے فرائض وہی ہیں جو اس نے بھارت کے جارحانہ حملے کے جواب میں تاشقند کے بدنام زمانہ معاہدے سے پہلے ادا کیے تھے اور ساری قوم کا خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ افواج پاکستان کے وہ افراد جو فوج سے ریٹائر ہو چکے ہیں، بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ فوج کا کام ملک کا دفاع ہے اور اسے سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس یقین کا بھی اظہار کرتے رہے ہیں کہ وہ موجودہ سیاسی کشمکش سے علیحدہ رہے گی۔ پھر فوج کو موجودہ حالات میں ملوث کرنے کے خطرات سے خود صدر ایوب بھی آگاہ ہیں اور وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے بھی یہ خطرہ مول لینے سے بچیں گے۔ دراصل یہی سبب ہے کہ انھوں نے حزب اختلاف کے اس حصے سے مصالحت یا

لاہور کی ایک طالبہ پولیس کے نرغے میں

ذوالفقار علی بھٹو

مذاکرات

پاکستان پیپلز پارٹی ان مذاکرات میں شامل نہیں ہو رہی جو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان راولپنڈی میں ہونے والے ہیں۔ عوام مراعات نہیں چاہتے وہ حکومت کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ موجودہ صورت حال سے نبٹنے کے لیے انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مذاکرات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے۔ ہماری دعا ہے کہ جو لوگ مذاکرات میں شامل ہو رہے ہیں وہ اپنے خیال کے مطابق جمہوری حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

مذاکرات کی کامیابی کے لیے ہم کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز کی حیثیت مذاکرات میں ہماری شمولیت کی شرائط کی نہیں ہے۔ البتہ یہ تجاویز حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرے میں مدد دے سکتی ہیں۔ تجاویز حسب ذیل ہیں :

(۱) حکومت اخبارات کی مکمل آزادی [illegible] اور قانونی تبدیلیاں عمل میں لانے سے پہلے جن کے ذریعے اخبارات کے متعلق سخت گیر قوانین واپس لیے جائیں، اخبارات پر سے ہر طرح کی پابندیاں اٹھا لینے کا وعدہ کیا جائے۔

(۲) صدرِ مملکت نے خود اعتراف کیا ہے کہ کم ترقی یافتہ علاقوں کے عوام کی شکایات دُور کرنے کی اشد ضرورت ہے گول میز کانفرنس کی سرکاری ٹیم میں ان علاقوں کے نمائندے بھی شامل ہیں اس لیے صدرِ مملکت کو متذکرہ علاقوں سے عوامی نمائندوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مدعو کرنا چاہیئے۔

(۳) حکومت کو وعدہ کرنا چاہیئے کہ وہ طلبا کے مسائل کے متعلق قوانین وضع کرنے سے پہلے طلبا کے تمام مطالبات اور مسائل کے متعلق طلبا کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کرے گی۔

(۴) حکومت تمام سیاسی زعما، لیبر لیڈروں، کارکنوں اور طلبا کو جنہیں ابھی تک رہا نہیں کیا گیا یا حفاظتی قوانین کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے فوراً رہا کر دے۔

(۵) حکومت اعلان کرے کہ جو افراد ہلاک ہوئے ان کے ورثا کو مناسب خون بہا ادا کیا جائے اور عوامی جمہوریت میں جو افراد مجروح ہوئے انہیں بھی معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(۶) حکومت ہائی کورٹ کے کسی جج یا عدلیہ کے کسی اور اہم فرد کو مساجد کی بے حرمتی اور عوام پر پولیس اور انتظامیہ کے متشددانہ اقدامات کی آزاد تحقیقات کے لیے مقرر کرے۔

(۷) گزشتہ نومبر کی ۷ تاریخ کو راولپنڈی اور نوشہرہ میں جو پولیس فائرنگ ہوئی تھی اور جس کے بعد حکومت نے جبر و تشدد کی کارروائیاں شروع کر دیں اُن کی آزادانہ تحقیقات کی جائے۔

(۸) حکومت پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ منسوخ کرنے کا وعدہ کرے اور اس قانون کا نفاذ ختم کر دے۔

(۹) سرکاری اراضی کو اراضی کی فروخت "سوا ان کسانوں کے جو زمینوں کے مالک نہیں ہیں یا جن کے لیے کم اراضی ہے باقی تمام افراد کے لیے بند کر دی جائے۔

(۱۰) لیبر لیڈروں کے ساتھ مشورہ کر کے ٹریڈ یونینوں پر ہڑتالوں کی پابندی ختم کر دی جائے اور جو تنظیمیں ٹریڈ یونینوں کے اصولوں کے منافی ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔

سمجھوتے بازی کرنے کے لیے قائدین کو طلب کیا ہے۔

مولانا مودودی کا یہ کہنا کہ بجا ہے کہ عوام فوج سے متصادم نہیں ہونا چاہتے لیکن اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ اس بات کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے عوام نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ فوج سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ فوج تو درکنار انہوں نے اس قسم کا چیلنج کبھی پولیس کو بھی نہیں کیا تھا۔ اب اگر پولیس طالب علموں اور دیگر عوامی جلوسوں پر گولی چلاتی ہے، لاٹھیاں برساتی ہے یا سول حکام کی دعوت پر نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے فوج آجاتی ہے اور اس کی فائرنگ سے راجشاہی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنے شاگردوں کو بچانے کی کوشش میں شہید ہو جاتا ہے تو عوام اس کے ذمہ دار کس طرح ٹھہریں گے۔

مولانا مودودی نے یہ بھی کہا ہے کہ جمہوری مجلس عمل کے لیڈر مذاکرات میں عوامی اور طالب علموں کی جانب سے پیش کردہ مطالبات کو منوانے کی کوشش کریں گے اور اگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو وہ بات چیت چھوڑ کر چلے آئیں گے۔ لیکن اگر تجربے سے سبق حاصل کرنے کا اصول درست ہے تو وہ تجربہ حال ہی میں جمہوری مجلس عمل کے اس بیان سے ہو چکا ہے جو مذاکرات کی دعوت قبول کرتے ہوئے جاری کیا گیا تھا۔ اس بیان میں یہ کہا گیا تھا کہ حکومت نے "نہ صرف جمہوری مجلس عمل کی پیشگی شرائط قبول کر لی ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی مذاکرات کے لیے فراہم کرنے پر رضامند ہو گئی ہے"۔ "جمہوری مجلس عمل" کی پیشگی شرائط میں ہنگامی حالات کے خاتمے کے علاوہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور شہری حقوق کی بحالی کا بھی مطالبہ شامل تھا۔ جب سے مجلسِ عمل نے شرکت کا فیصلہ کیا ہے تب سے، سینکڑوں سیاسی قیدی اور طالب علم لیڈر جیلوں میں پڑے ہیں۔ بہت سے قیدی جو ہنگامی حالات کے خاتمے کے بعد رہا کیے گئے دوبارہ سیفٹی ایکٹ اور سیکورٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیے گئے ہیں اور کراچی اور ڈھاکہ جیسے شہروں میں دفعہ ۱۴۴ اور پھر کرفیو لگا دیا گیا ہے ــــ اس کے علاوہ اس کے دوران میں کراچی، ڈھاکہ اور راجشاہی میں پولیس اور فوج کی گولیوں سے کئی افراد ہلاک ہوئے ہیں۔

اگر شہری حقوق کی بحالی اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کی پیشگی شرط اس طرح پوری ہوئی ہے تو آگے چل کر جمہوری مجلسِ عمل براہِ راست انتخاب کے ذریعہ پارلیمنٹ کے الیکشن اور طالب علموں کے مطالبات کی ادھوری تکمیل کو بھی "خاطر خواہ" نتیجہ قرار دے دے گی۔

عوام اپنے مطالبات کی ادھوری تکمیل کو تکمیل نہیں سمجھتے اور اسی وجہ سے وہ مولانا مودودی اور جمہوری مجلسِ عمل کے بعض دیگر رہنماؤں کی ان اپیلوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے جو وہ مارشل لاء کا ہوّا" دکھا کر ان سے کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھاکہ، کراچی، لاہور، پنڈی اور دیگر مقامات پر عوامی تحریک

جاری ہے جمہوری مجلس کے بجائے عوام ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا بھاشانی جیسے عوامی رہنماؤں کی قیادت میں اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

قائدِ اعظمؒ سے دشمنی کا نیا ثبوت

مولانا مودودی کے بیان کے ساتھ ساتھ لاہور کی سڑکوں پر جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء کے کارکنوں کو رات کی تاریکی میں شہر کی دیواروں پر مختلف قسم کے نعرے لکھتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں "بھٹو فساد کی جڑ ہے" ــــ "سوشلزم کا مطلب کیا ــــ خون خرابہ۔ انکارِ خدا"۔ "اسلامی سوشلزم ایک فریب ہے" ــــ یہ نعرے مولانا مودودی کے بیان کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جماعت اسلامی کو سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ آمرانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ساری قوم بالخصوص طالب علموں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور اس تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ اوّلاً جماعت اسلامی اور اس کے طالب علم محاذ نے اس تحریک میں شامل ہو کر اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور جب اس کوشش میں انھیں منہ کی کھانی پڑی تو وہ اب اتہام تراشی پر اُتر آئے ہیں۔ اب ان کی نظر میں اسلامی مساوات کی سربلندی کے لیے چلنے والی تحریک کا مقصد خون خرابہ اور انکارِ خدا بن گیا ہے جس تحریک میں قوم کے نونہالوں اور عام شہریوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی ہے اور جماعت اسلامی کے لیڈروں کو اس قابل کیا ہے کہ وہ ایوانِ صدر میں جا کر اپنی دکانیں چمکائیں۔ آج اس تحریک کو انھوں نے "خون خرابہ" اور "انکارِ خدا" کے مکروہ الزاموں سے نوازا ہے۔

جماعت اسلامی جو تحریکِ پاکستان اور اس کے عظیم قائد، قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بدترین دشمن تھی، نے ایک بار پھر قائدِ اعظم کی شان میں اسلامی سوشلزم کو "فریب" کہہ کر گستاخی کی ہے۔

جماعت اسلامی اسلام کے نام پر بار بار عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس نے کراچی کے ان باشندوں پر جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کی خاطر لٹا کر پاکستان بنایا تھا اور اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے پاکستان کو آباد کیا، "اسلام مُردہ باد" کا نعرہ لگانے تک کا شرمناک الزام لگایا لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس بار پھر جماعت اسلامی کو قائدِ اعظم کے فرمودات کا مذاق اڑانے اور "اسلامی سوشلزم" کو فریب کہنے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور وہ سزا یہی ہے کہ اسے عوام کی نفرت کا شکار ہونا ہوگا۔ کیونکہ بقول قائدِ اعظمؒ جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیادیں اسلامی سوشلزم پر ہیں تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمان عوام کی ترجمانی کی جاتی ہے۔"

خوش آمدید۔ امان اللہ خان

امان اللہ خان پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک جواں سال رہنما ہیں اور طالب علموں میں اپنی لیاقت، خطابت اور قیادت کے باعث عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا سارا ڈھب انقلابی ہے۔ اسی پاداش میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے نکالے گئے اور اسی گناہ میں انہیں چیئرمین بھٹو کے ہمراہ ۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن اپنے اسی انقلابی کردار نے انہیں اس جوانعمری میں ایک سیاسی پارٹی میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

امان اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ڈیفنس آف پاکستان رُولز کے آخری حملے میں سب سے لمبی قید کاٹ کر آرہے ہیں بلکہ اس کالے قانون کے تحت ان کے افکار پر بھی ڈاکہ پڑ چکا ہے۔ حکومت نے ان کی زیرِ تصنیف کتاب "ماسٹرز ناٹ ماسٹرز" کی اشاعت روک دی تھی۔ امید ہے کہ اب امان اللہ خان کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب بھی رہا ہو جائے گی اور جلد از جلد شائع ہو جائے گی۔

ہم امان اللہ خان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

سیاسی مظاہرین کو بھی رہا کیا جائے

پاکستان پیپلز پارٹی ڈیرہ اسماعیل خان کے کنوینر، حق نواز خان گنڈاپور نے بجا طور پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ عوامی مظاہروں میں گرفتار ہونے والے ان سینکڑوں طلبا اور نوجوانوں کو ابھی تک رہا کیا گیا جنہیں اخلاقی الزامات عائد کر کے جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ حکومت نے چند جانے پہچانے سیاسی کارکنوں کو رہا کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ سب سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ ابھی وہ مظاہرین رہا نہیں ہوئے جنہیں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ایسے تمام لوگوں کو جلد از جلد رہا کرنا بے حد ضروری ہے، ورنہ حکومت کو علم ہونا چاہیئے کہ اُدھورے اقدامات سے وہ ملک کی فضا کو کبھی نہ سنبھال سکے گی۔

مختار رانا سے امتیازی سلوک کیوں؟

پیپلز اکیڈمی لائل پور کے پرنسپل مسٹر مختار رانا کو ادھر رہا کیا گیا ادھر انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت ایک طرف تو طلبا کو مطمئن کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف مختار رانا صاحب جیسے ہر دلعزیز اُستاد کو بار بار قید کرتی ہے اور راج شاہی یونیورسٹی کے اساتذہ کو گولیوں کا نشانہ بناتی ہے۔

ہم مختار رانا کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں جلد از جلد رہا کر کے ان سے امتیازی سلوک ختم کیا جائے۔

طے ہوں گے۔ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا کہ حکمران ٹولے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ موجودہ عوامی تحریک کے زور کو توڑ دے۔

مذاکرات میں شامل ہونے کے لیے صدر کا دعوت نامہ نامنظور کرتے ہوئے مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی نے ان حالات کا تذکرہ کیا ہے جو اس وقت ملک کو درپیش ہیں۔ انہوں نے اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ عوام پر تشدد کا دور دورہ ہے۔ بہت سے سیاسی قیدی جو ہنگامی حالات کے خاتمے پر رہا کیے گئے تھے دوبارہ نظر بند کیے جا رہے ہیں۔ سیاسی اور طالب علم کارکن جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ پولیس کے تشدد کا شکار ہونے والوں کے ورثاء کو اب تک خوں بہا نہیں دیا گیا ہے۔ مسجدوں میں پولیس کے داخلہ سے جو بے حرمتی ہوئی ہے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ طالبعلموں کے مطالبات قشۂ تکمیل ہیں۔ پریس پر پابندیاں بدستور جاری ہیں۔ بہت سارے شہروں میں کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ تا حال نافذ ہے۔ پولیس پُرامن اور نہتے عوام پر تو گولیاں اور ڈنڈے برسا رہی ہے لیکن سرکاری سرپرستی میں غنڈہ عناصر گولیاں چلاتے اور چاقو مارتے پھر رہے ہیں اور "قانون کا ہاتھ" ان کے گریبانوں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ سرکاری زمینیں ابھی تک غیر کسانوں کے ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں اور مزدور حقِ ہڑتال سے محروم ہیں۔

مولانا بھاشانی نے کہا ہے کہ حکومت کو نوشتۂ دیوار پڑھنا چاہیئے اور مسٹر بھٹو نے تو حکومت کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ انہوں نے عوام کی موجودہ جدوجہد کی سیدھے سادھے الفاظ میں ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ عوام تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ تبدیلی بہتری کے لیے ہونی چاہیئے اور اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والا نیا نظام ایسا ہونا چاہیئے جو بدعنوانیوں، رشوت ستانی، سماجی اور اقتصادی ناانصافیوں کی لعنتوں سے پاک ہو، ایسے نظام کا محض ظاہری رکھ رکھاؤ ہی جمہوری نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کی بنیادیں ـــــ معاشی و معاشرتی ادارے ـــــ بھی جمہوری ہونے چاہئیں۔ مسٹر بھٹو نے موجودہ فضا کو بہتر بنانے کے لیے دس تجاویز پیش کی ہیں اور مولانا بھاشانی نے مشرقی پاکستان کے طلباء کی جانب سے پیش کردہ گیارہ نکات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ گیارہ نکات نیشنل عوامی پارٹی کے چودہ نکات کو پورا کرتے ہیں۔

مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی کے علاوہ آزاد سیاستدانوں یعنی ایئر مارشل اصغر خاں، لفٹیننٹ جنرل اعظم خاں اور سید محبوب مرشد نے بھی مذاکرات میں شامل ہونے سے بڑی حد تک اس بنا پر انکار کر دیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایک آزاد فرد کی طرح کانفرنس میں شریک نہیں ہو رہے اور اگرتلہ سازش کیس تا حال واپس نہیں لیا گیا۔ ان حضرات نے پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہوں یعنی مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشانی کی شرکت پر بھی زور دیا ہے۔ چھ نکات کی حامی عوامی لیگ نے بھی اپنے لیڈر شیخ مجیب الرحمن کی غیر موجودگی میں مذاکرات میں شرکت سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ شیخ مجیب اگرتلہ سازش کیس کی موجودگی میں ایک مجرم کی حیثیت سے کسی قسم کے مذاکرات میں شامل ہونے پر تیار نہیں۔

جہلم میں بیگم نصرت بھٹو کے شاندار استقبال کا ایک منظر

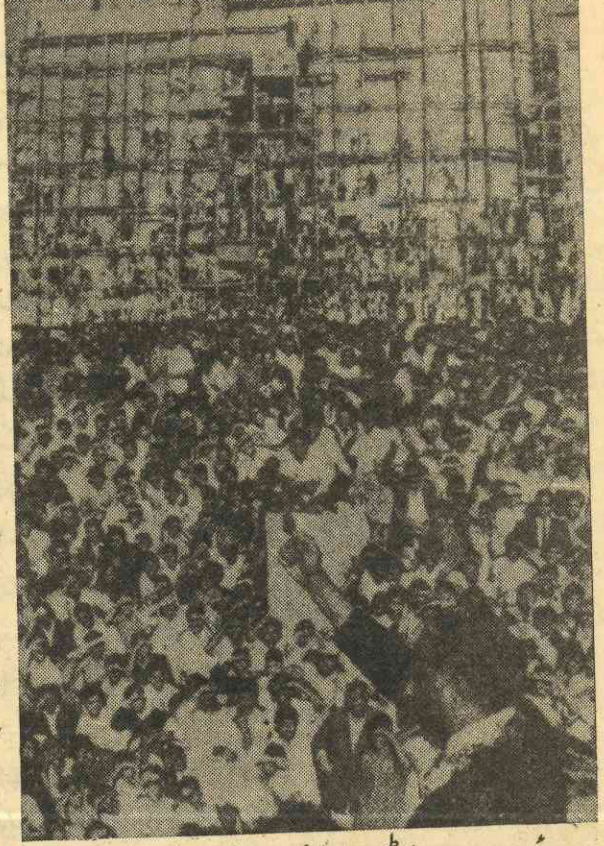

چیئرمین بھٹو قائد اعظم کے مزار پر

امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی نے حکومت اور "جمہوری مجلس عمل" کے مذاکرات شروع ہونے سے قبل اپنی جماعت کے ارکان سے خطاب کے دوران سوالات کے جواب میں کہا کہ اگر موجودہ "اشتعال انگیز" صورت حال زیادہ عرصہ برقرار رہی تو خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں اور ان نتائج میں یہ بھی عین ممکن ہے کہ صدر ایوب فوجی ہاتھ کمان کو ملک میں مارشل لاء کے نفاذ پر آمادہ کرلیں۔"

مولانا کا یہ بیان ساری قوم کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اولاً تو مولانا نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ موجودہ تحریک میں اشتعال انگیزی کا جز کب اور کس نے داخل کیا ہے۔ اگر ان کے سابقہ بیانات کو نظر میں رکھا جائے تو مولانا مودودی اور ان کی جماعت اور ان کے علاوہ جمہوری مجلس عمل کے سربراہ نواب زادہ نصر اللہ اور بعض دیگر لیڈر عوام کے "ایک حلقے" پر شرپسندی کا الزام بھی تھوپ چکے ہیں۔ ان دونوں بیانات کو ملا کر پڑھنے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی اور دائیں بازو کے بعض دوسرے لیڈر عوامی جدوجہد کی شدت سے خوفزدہ ہو کر اب عوام کو مارشل لاء کے "توے" سے ڈرانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک صدر ایوب کا تعلق ہے وہ سابقہ "مارشل لا" کے خالق رہ چکے ہیں اور اس مارشل لاء کے نتیجے میں جو کچھ ہوا ہے اس سے کوئی ذی ہوش بے خبر نہیں ہے۔ مولانا مودودی کا یہ باور کرنا کہ موجودہ صورت حال کے نتیجے میں یہ عین ممکن ہے کہ صدر ایوب فوج کی ہائی کمان کو مارشل لاء لگانے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بپھری ہوئی قوم کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ "مجلس عمل" نے مذاکرات میں شرکت کر کے قوم کے ساتھ غداری کے بجائے بڑا احسان کیا ہے۔ اور قوم کو آئندہ دس سال تک کے لیے آمریت سے بچا لیا ہے۔ اولاً تو مولانا مودودی اور ان کی قبیل کے لوگوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ اس ملک کے عوام غیر عوامی جمہوریت اور شخصی آمریت دونوں کا تجربہ کر چکے ہیں اور اب وہ اس قسم کے کسی دھکے سلے کو برداشت نہیں کریں گے۔ اگر مولانا مودودی، ان کے حواری اور ہمنوا عوام پر بھروسہ رکھتے تو اس قسم کی بزدلی کا ثبوت نہ دیتے اور موجودہ تحریک کو دھونس اور دھاندلی کے تحت دبائے جانے کے خلاف اسی طرح سے آواز اٹھاتے جس طرح مغربی پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نے اٹھائی ہے۔ پھر انھیں اس ملک کے طالب علموں پر بھی، جو موجودہ تحریک کے ہراول دستہ اور ہیرو ہیں، بھروسا کرنا چاہیے تھا جنھوں نے اب تک تشدد کی ہر دھمکی کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور جان کی قربانی تک سے دریغ نہیں کیا۔

مولانا مودودی نے مارشل لاء کے خطرے کا اظہار کر کے پاکستانی افواج کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساری قوم اس بات پر متفق ہے کہ پاکستانی فوج کے فرائض وہی ہیں جو اس نے بھارت کے جارحانہ حملے کے جواب میں تاشقند کے بدنام زمانہ معاہدے سے پہلے ادا کیے تھے اور ساری قوم کا خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ افواج پاکستان کے وہ افراد جو فوج سے ریٹائر ہو چکے ہیں، بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ فوج کا کام ملک کا دفاع ہے اور اسے سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس یقین کا بھی اظہار کرتے رہے ہیں کہ وہ موجودہ سیاسی کشمکش سے علیحدہ رہے گی۔ پھر فوج کو موجودہ حالات میں ملوث کرنے کے خطرات سے خود صدر ایوب بھی آگاہ ہیں اور وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے بھی یہ خطرہ مول لینے سے بچیں گے۔ دراصل یہی سبب ہے کہ انھوں نے حزب اختلاف کے اس حصے سے مصالحت یا

لاہور کی ایک طالبہ پولیس کے نرغے میں

ذوالفقار علی بھٹو

مذاکرات

پاکستان پیپلز پارٹی ان مذاکرات میں شامل نہیں ہو رہی جو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان راولپنڈی میں ہونے والے ہیں۔ عوام مراعات نہیں چاہتے وہ حکومت کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ موجودہ صورت حال سے نبٹنے کے لیے انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مذاکرات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے۔ ہماری دعا ہے کہ جو لوگ مذاکرات میں شامل ہو رہے ہیں وہ اپنے خیال کے مطابق جمہوری حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

مذاکرات کی کامیابی کے لیے ہم کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز کی حیثیت مذاکرات میں ہماری شمولیت کی شرائط کی نہیں ہے۔ البتہ یہ تجاویز حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرے میں مدد دے سکتی ہیں۔ تجاویز حسب ذیل ہیں :

(۱) حکومت اخبارات کی مکمل آزادی [illegible] اور قانونی تبدیلیاں عمل میں لانے سے پہلے جن کے ذریعے اخبارات کے متعلق سخت گیر قوانین واپس لیے جائیں، اخبارات پر سے ہر طرح کی پابندیاں اٹھا لینے کا وعدہ کیا جائے۔

(۲) صدرِ مملکت نے خود اعتراف کیا ہے کہ کم ترقی یافتہ علاقوں کے عوام کی شکایات دُور کرنے کی اشد ضرورت ہے گول میز کانفرنس کی سب کمیٹی میں ان علاقوں کے نمائندے بھی شامل ہیں اس لیے صدرِ مملکت کو متذکرہ علاقوں سے عوامی نمائندوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مدعو کرنا چاہیئے۔

(۳) حکومت کو وعدہ کرنا چاہیئے کہ وہ طلبا کے مسائل کے متعلق قوانین وضع کرنے سے پہلے طلبا کے تمام مطالبات اور مسائل کے متعلق طلبا کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کرے گی۔

(۴) حکومت تمام سیاسی زعما، لیبر لیڈروں کارکنوں اور طلبا کو جنہیں ابھی تک رہا نہیں کیا گیا یا حفاظتی قوانین کے تحت دوبارہ گرفتار کیا گیا ہے فوراً رہا کر دے۔

(۵) حکومت اعلان کرے کہ جو افراد ہلاک ہوئے ان کے ورثا کو مناسب خون بہا ادا کیا جائے اور عوامی جمہوریت میں جو افراد مجروح ہوئے انہیں بھی معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(۶) حکومت ہائی کورٹ کے کسی جج یا عدلیہ کے کسی اور اہم فرد کو مساجد کی بے حرمتی اور عوام پر پولیس اور انتظامیہ کے متشددانہ اقدامات کی آزاد تحقیقات کے لیے مقرر کرے۔

(۷) گزشتہ نومبر کی، تاریخ کو راولپنڈی اور نوشہرہ میں جو پولیس فائرنگ ہوئی تھی اور جس کے بعد حکومت نے جبر و تشدد کی کارروائیاں شروع کر دیں اُن کی آزادانہ تحقیقات کی جائے۔

(۸) حکومت پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ منسوخ کرنے کا وعدہ کرے اور اس قانون کا نفاذ ختم کر دے۔

(۹) سرکاری اراضی کو اراضی کی فروخت، سوا ان کسانوں کے جو زمینوں کے مالک نہیں ہیں یا جن کے لیے کم اراضی ہے باقی تمام افراد کے لیے بند کر دی جائے۔

(۱۰) لیبر لیڈروں کے ساتھ مشورہ کر کے ٹریڈ یونینوں پر ہڑتالوں کی پابندی ختم کر دی جائے اور جو تنظیمیں ٹریڈ یونینوں کے اصولوں کے منافی ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔

سمجھوتے بازی کرنے کے لیے قائدین کو طلب کیا ہے۔

مولانا مودودی کا یہ کہنا کہ بجا ہے کہ عوام فوج سے متصادم نہیں ہونا چاہتے لیکن اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ اس بات کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں جہاں تک عوام کا تعلق ہے عوام نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ فوج سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ فوج تو درکنار انہوں نے اس قسم کا چیلنج کبھی پولیس کو بھی نہیں کیا تھا۔ اب اگر پولیس طالب علموں اور دیگر عوامی جلوسوں پر گولی چلاتی ہے، لاٹھیاں برساتی ہے یا سول حکام کی دعوت پر نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے فوج آجاتی ہے اور اس کی فائرنگ سے راجشاہی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنے شاگردوں کو بچانے کی کوشش میں شہید ہو جاتا ہے تو عوام اس کے ذمہ دار کس طرح ٹھہریں گے۔

مولانا مودودی نے یہ بھی کہا ہے کہ جمہوری مجلس عمل کے لیڈر مذاکرات میں عوامی اور طالب علموں کی جانب سے پیش کردہ مطالبات کو منوانے کی کوشش کریں گے اور اگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو وہ بات چیت چھوڑ کر چلے آئیں گے۔ لیکن اگر تجربے سے سبق حاصل کرنے کا اصول درست ہے تو وہ تجربہ حال ہی میں جمہوری مجلس عمل کے اس بیان سے ہو چکا ہے جو مذاکرات کی دعوت قبول کرتے ہوئے جاری کیا گیا تھا۔ اس بیان میں یہ کہا گیا تھا کہ حکومت نے "نہ صرف جمہوری مجلس عمل کی پیشگی شرائط قبول کر لی ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی مذاکرات کے لیے فراہم کرنے پر رضامند ہو گئی ہے"۔ "جمہوری مجلس عمل" کی پیشگی شرائط میں ہنگامی حالات کے خاتمے کے علاوہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور شہری حقوق کی بحالی کا بھی مطالبہ شامل تھا۔ جب سے مجلسِ عمل نے شرکت کا فیصلہ کیا ہے تب سے، سینکڑوں سیاسی قیدی اور طالب علم لیڈر جیلوں میں پڑے ہیں۔ بہت سے قیدی جو ہنگامی حالات کے خاتمے کے بعد رہا کیے گئے دوبارہ سیفٹی ایکٹ اور سیکورٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیے گئے ہیں اور کراچی اور ڈھاکہ جیسے شہروں میں دفعہ ۱۴۴ اور پھر کرفیو لگا دیا گیا ہے ــــ اس کے علاوہ اس کے دوران میں کراچی، ڈھاکہ اور راجشاہی میں پولیس اور فوج کی گولیوں سے کئی افراد ہلاک ہوئے ہیں۔

اگر شہری حقوق کی بحالی اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کی پیشگی شرط اس طرح پوری ہوئی ہے تو آگے چل کر جمہوری مجلسِ عمل براہِ راست انتخاب کے ذریعہ پارلیمنٹ کے الیکشن اور طالب علموں کے مطالبات کی ادھوری تکمیل کو بھی "خاطر خواہ" نتیجہ قرار دے دے گی۔

عوام اپنے مطالبات کی ادھوری تکمیل کو تکمیل نہیں سمجھتے اور اسی وجہ سے وہ مولانا مودودی اور جمہوری مجلسِ عمل کے بعض دیگر رہنماؤں کی ان اپیلوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے جو وہ مارشل لاء کا ہوّا" دکھا کر ان سے کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھاکہ، کراچی، لاہور، پنڈی اور دیگر مقامات پر عوامی تحریک

جاری ہے جمہوری مجلس کے بجائے عوام ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا بھاشانی جیسے عوامی رہنماؤں کی قیادت میں اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

قائدِ اعظمؒ سے دشمنی کا نیا ثبوت

مولانا مودودی کے بیان کے ساتھ ساتھ لاہور کی سڑکوں پر جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء کے کارکنوں کو رات کی تاریکی میں شہر کی دیواروں پر مختلف قسم کے نعرے لکھتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: "بھٹو فساد کی جڑ ہے" ــــ "سوشلزم کا مطلب کیا ــــ خون خرابہ۔ انکارِ خدا"۔ "اسلامی سوشلزم ایک فریب ہے" ــــ یہ نعرے مولانا مودودی کے بیان کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جماعت اسلامی کو سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ آمرانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ساری قوم بالخصوص طالب علموں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور اس تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ اوّلاً جماعت اسلامی اور اس کے طالب علم محاذ نے اس تحریک میں شامل ہو کر اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور جب اس کوشش میں انھیں منہ کی کھانی پڑی تو وہ اب اتہام تراشی پر اتر آئے ہیں۔ اب ان کی نظر میں اسلامی مساوات کی سربلندی کے لیے چلنے والی تحریک کا مقصد خون خرابہ اور انکارِ خدا بن گیا ہے جس تحریک میں قوم کے نونہالوں اور عام شہریوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی ہے اور جماعت اسلامی کے لیڈروں کو اس قابل کیا ہے کہ وہ ایوان صدر میں جا کر اپنی دکانیں چمکائیں۔ آج اس تحریک کو انھوں نے "خون خرابہ" اور "انکارِ خدا" کے مکروہ الزاموں سے نوازا ہے۔

جماعت اسلامی جو تحریک پاکستان اور اس کے عظیم قائد قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بدترین دشمن تھی، نے ایک بار پھر قائدِ اعظم کی شان میں اسلامی سوشلزم کو فریب کہہ کر گستاخی کی ہے۔

جماعت اسلامی اسلام کے نام پر بار بار عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس نے کراچی کے ان باشندوں پر جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کی خاطر لٹا کر پاکستان بنایا تھا اور اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے پاکستان کو آباد کیا، "اسلام مُردہ باد" کا نعرہ لگانے تک کا شرمناک الزام لگایا لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس بار پھر جماعت اسلامی کو قائدِ اعظم کے فرمودات کا مذاق اڑانے اور "اسلامی سوشلزم" کو فریب کہنے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور وہ سزا یہی ہے کہ اسے عوام کی نفرت کا شکار ہونا ہوگا۔ کیونکہ بقول قائدِ اعظم "جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیادیں اسلامی سوشلزم پر ہیں تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمان عوام کی ترجمانی کی جاتی ہے"۔

خوش آمدید۔ امان اللہ خان

امان اللہ خان پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک جواں سال رہنما ہیں اور طالب علموں میں اپنی لیاقت، خطابت اور قیادت کے باعث عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا سارا ڈھب انقلابی ہے۔ اسی پاداش میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے نکالے گئے اور اسی گناہ میں انہیں چیئرمین بھٹو کے ہمراہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن اپنے اسی انقلابی کردار نے انہیں اس جوانعمری میں ایک سیاسی پارٹی میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

امان اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ڈیفنس آف پاکستان رولز کے آخری حملے میں سب سے لمبی قید کاٹ کر آ رہے ہیں بلکہ اس کالے قانون کے تحت ان کے افکار پر بھی ڈاکہ پڑ چکا ہے۔ حکومت نے ان کی زیر تصنیف کتاب "ماسٹرز ناٹ ماسٹرز" کی اشاعت روک دی تھی۔ امید ہے کہ اب امان اللہ خان کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب بھی رہا ہو جائے گی اور جلد از جلد شائع ہو جائے گی۔

ہم امان اللہ خان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

سیاسی مظاہرین کو بھی رہا کیا جائے

پاکستان پیپلز پارٹی ڈیرہ اسماعیل خان کے کنوینر، حق نواز خان گنڈاپور نے بجا طور پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ عوامی مظاہروں میں گرفتار ہونے والے ان سینکڑوں طلباء اور نوجوانوں کو ابھی تک رہا کیا گیا جنہیں اخلاقی الزامات عائد کر کے جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ حکومت نے چند جانے پہچانے سیاسی کارکنوں کو رہا کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ سب سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ ابھی وہ مظاہرین رہا نہیں ہوئے جنہیں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ایسے تمام لوگوں کو جلد از جلد رہا کرنا بے حد ضروری ہے، ورنہ حکومت کو علم ہونا چاہیئے کہ ادھورے اقدامات سے وہ ملک کی فضا کو کبھی نہ سنبھال سکے گی۔

مختار رانا سے امتیازی سلوک کیوں؟

پیپلز اکیڈمی لائل پور کے پرنسپل مسٹر مختار رانا کو ادھر رہا کیا گیا ادھر انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت ایک طرف تو طلباء کو مطمئن کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف مختار رانا صاحب جیسے ہر دلعزیز استاد کو بار بار قید کرتی ہے اور راج شاہی یونیورسٹی کے استادوں کو گولیوں کا نشانہ بناتی ہے۔

ہم مختار رانا کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں جلد از جلد رہا کر کے ان سے امتیازی سلوک ختم کیا جائے۔

سیاسی لیڈر یا عوام

نیوز ویک ۱۰ فروری ۱۹۶۹ء

جنرل محمد ایوب کے دس سالہ دورِ حکومت کو اکثر اوقات ترقی پذیر ممالک میں ایک مثالی حکومت کی حیثیت دی گئی ہے اس دور میں پاکستانیوں نے ملک کی ترقی کے لیے ہر طرح تندہی، اعلیٰ کارکردگی اور توجہ سے کام کیا ہے۔ یہ ترقی ایک شاندار کہانی تھی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے عرصے میں قومی پیداوار میں ۵۵ فیصد اضافہ ہوا۔ چھوٹی صنعتی پیداوار میں بھی ملک خود کفیل ہو گیا۔ آبپاشی اور اچھے بیج کے استعمال سے اس سال زرعی پیداوار میں ۲۳ فیصد اضافہ ہوا اور پاکستان جو ہر سال بیس لاکھ ٹن گندم درآمد کرتا تھا، چند سالوں میں خوراک کے لحاظ سے بھی خود کفیل ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔

صدر ایوب کے دشمن بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ترقی صدر کے پدرانہ طرزِ حکومت کا نتیجہ ہے۔ سینڈھرسٹ کا تعلیم یافتہ یہ فوجی افسر اعلیٰ کارکردگی کو انسان کی سب سے بڑی خوبی سمجھتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ پارلیمانی طرزِ حکومت ناکارکردگی کا مرقع ہے۔ نتیجے کے طور پر پاکستانی عوام یہ محسوس کرنے لگے کہ اعلیٰ کارکردگی محض ایک دھوکا ہے اور اس لفظ کے خول میں پاکستانی عوام کو فوجی انداز کے شکنجے میں کس کر رکھ دیا گیا ہے۔

پچھلے ہفتے مایوسی اور بیزاری کا طوفان ابل پڑا۔ ایسے ہنگامے بپا ہوئے کہ پاکستان کی تاریخ میں ایسے زبردست ہنگامے کبھی نہیں ہوئے۔ ننگے پاؤں، ہاتھوں میں اینٹ یا پتھر اٹھائے ہوئے ہجوم نے کراچی کی زندگی کو معطل کر دیا۔ مایوس عوام نے ان تاجروں کی دکانیں بھی جلا ڈالیں جو عوام کی ہمدردی میں دکانیں بند نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ عوام نے گورنمنٹ پارٹی کے ایک لیڈر کے گھر کو نذرِ آتش کیا تو اس ہجوم کو پندرہ ٹرک فوج بمشکل تمام ہٹا سکی۔ انگریزی طرز کی ڈنڈوں سے لیس پولیس کی مدد سے شہری نظام دوبارہ بحال کیا گیا۔ کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی پچاس ہزار کا ہجوم ایوب..... ہائے ہائے چلا چلا کر ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں اور نیم برہنہ رکشا ڈرائیوروں نے جن کے پاس اینٹ پتھر کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ تھا فوج کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ ایک ہفتے کے ہنگاموں کا نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں مارشل لاء تھا اور ہزاروں لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں کوئی تیس کے قریب مظاہرین مارے گئے تھے۔

پاکستان کے اس منجمد استحکام کے خلاف بہت سی شکایات ہیں۔ مشرقی پاکستان کی دیہاتی آبادی غربت کا شکار ہے۔ ان کا خیال ہے ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد ایوب گورنمنٹ نے کارخانوں کی طرف توجہ دی ہے اور کاشتکاری اور تعلیم کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ شہروں کو گلہ ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام نے پریس اور قانون تک کو مجوس کر دیا ہے۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کی بدولت ہی الیکشن کے نتائج توڑ مروڑ کر حکومت کی مرضی کے مطابق نتائج کا اعلان کیا جاتا ہے۔ طلباء کو یہ بھی گلہ ہے کہ اس نظام کے تحت اگر وہ کسی سیاسی نوعیت کے کام میں حصہ لیں جو موجودہ گورنمنٹ کی مرضی کے خلاف ہے تو ان کی ڈگریاں چھینی جا سکتی ہیں۔ قصہ مختصر عوام کی مرضی ایک شخص کی مرضی کی تابع ہو کر رہ گئی ہے۔

صدر ایوب کی بیماری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ بیماری سے اُٹھنے کے بعد انھوں نے ریاست کے بہت سے اُمور کو انتظامیہ کے فیصلوں پر چھوڑ دیا۔ پچھلے چند سالوں میں وہی رشوت اور بدعنوانی جس کے خلاف نظامِ حکومت تبدیل کیا گیا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر چکی ہے اگرچہ صدر کی ذات پر شبہ کم ہے مگر اس بات کا چرچا ہے کہ ان کا بیٹا گوہر ایوب وہ ہستی ہے جس کی وساطت سے سیاسی رعایتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کراچی کے محل میں جس میں تیرنے کے لیے مرمریں تالاب بنے ہوئے ہیں، گوہر ایوب ہفتے میں دو دفعہ ذاتی کچہری لگاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک کپتان ریٹائر ہونے کے بعد کروڑوں کے کاروبار کا مالک کیسے بن گیا۔

اس مایوسی اور بیزاری کا پہلا نشان تو پشاور میں صدر پر گولی چلانے کا واقعہ تھا۔ صدر کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ مگر اس کے جواب میں سیاسی لیڈروں کو عوام کو تشدد پر اکسانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں چالیس سالہ چین کا حامی ذوالفقار علی بھٹو بائیں بازو کی جماعتوں کا شہیدِ تشدد بن گیا۔ بھٹو کی گرفتاری ایک غلطی تھی۔ اس عمل نے ایئر مارشل اصغر خاں کو میدانِ سیاست میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اصغر کی ایک تقریر میں اس نے جمہوریت کی حمایت میں مبہم سا بیان دیا تھا۔ پھولوں کی بارش کا پیش خیمہ بن گئی۔ چند ہفتوں بعد اس کا رویہ سخت ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ایوب بدعنوانی، کنبہ پروری اور نااہلی کا نمائندہ ہے۔ اگر وہ قائم رہتا ہے تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس کو حکومت سے الگ ہو جانا چاہیے۔

ان حالات کے پیشِ نظر صدر ایوب نے مصلحت پسندی کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ سیاسی لیڈروں نے گفت و شنید کے لیے کانفرنس کا اعلان کیا ہے۔ صدر ایوب کو امید ہے کہ اس طرح وہ ملک کی سیاسی زندگی میں کچھ آزادی دے کر اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیں گے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسے نیم دلانہ اقدامات عوام کی تسلی کا باعث ہوتے ہیں یا نہیں۔ کراچی میں ایک ڈاڑھی والے آدمی نے نیوز ویک کے نمائندے کو بتایا کہ ایوب کو صرف سیاسی لیڈروں کو خوش نہیں کرنا عوام کے مطالبات ماننے ہیں، ہمارے مطالبات، عوام کے مطالبات۔

معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کے سوا...

جمہوری مجلس عمل نے سیاسی مسائل کے حل کے لیے صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کی دعوت اصولاً قبول کر لی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے مسئلے پر تعطل اس اصول پر اثر انداز نہیں ہوا۔ یہ فیصلہ خلاف توقع نہیں۔ پچھلے چند دنوں سے سیاسی حالات میں یکے بعد دیگرے جو تبدیلیاں آئیں ان کا منطقی نتیجہ مذاکرات کی دعوت قبول کر لینا ہی تھا۔ جمہوری مجلس عمل میں شامل جماعتوں کی اکثریت اپنے مزاج کے اعتبار سے زیادہ دیر تک کھلی کھلی عوامی تحریک کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی انہیں اس چیز کا احساس ہے کہ قوم کا ہر طبقہ اگر موجودہ حکومت کے خلاف انقلابی بغاوت کا پرچم لے کر باہر نکل آیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ عوام کو سیاسی جمہوریت کے تصور میں اتنی کشش نظر آئی کہ وہ خاک و خون کی گلرنگ وادیوں سے گزر گئے بلکہ اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ عوام کی وسیع معاشی و معاشرتی مشکلات نے مایوسی اور ناامیدی کی وہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ طوفان کا اُٹھنا مقدر ہو چکا تھا۔ یہ تحریک تو حالات کی تاریکی میں نشو و نما پا رہی تھی تو صرف اس طوفان کو پھوٹ بہنے کے لیے حالات کی سازگاری کا انتظار تھا۔ وہ حالات جمہوری مجلس عمل کے پیدا کردہ نہیں تھے لیکن یہ بات ضرور تسلیم کرنی ہوگی کہ مجلس عمل کی کارگزاری نے ان حالات کو متاثر ضرور کیا ہے۔ حالات کو متاثر کرنے کی قوت بھی اگرچہ اہم بات ہے لیکن بنیادی حالات کا رُخ متعین کرنے کی صلاحیت ہے۔

مجلس عمل کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہے کہ تحریک کا تسلسل حالات کو جس سمت میں لے جائے گا، اس پر انہیں کوئی قابو حاصل نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ یا تو اس کے جوش و خروش کو تھوڑا سا کم کر دیں یا کسی منزل پر کچھ تیز کر دیں۔ اس سے بڑھ کر اس کے رُخ کو بدلنا یا اس پر بند باندھنا ان کے بس کی بات نہیں۔

دائیں بازو کی جماعتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے عوامی تحریکوں کی آگ کا ایندھن فراہم نہیں کیا کرتیں لیکن ہمارے ہاں بعض مخصوص حالات کی مجبوریوں نے بات یہاں تک پہنچا دی کہ ان دائیں بازو کی جماعتوں کو وہی طریق کار اختیار کرنا پڑا جو عموماً بائیں بازو کی جماعتوں سے مخصوص ہے۔ ۱۴ فروری کی ملک گیر ہڑتال اس کی واضح مثال ہے۔ اس ہڑتال کی کامیابی پر کوئی بھی جماعت خود کو مبارک باد دے سکتی ہے لیکن اس ہڑتال کی کامیابی ہی نے جمہوری مجلس عمل کے اس احساس کو اور بھی شدید کر دیا ہے کہ حالات کا دھارا جس رُخ پہ بہہ رہا ہے اسے اگر منطقی نتیجے تک پہنچ جانے دیا گیا تو وہ منزل خود ان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی اس لیے ضروری ہے کہ مظاہروں اور ہڑتالوں سے نجات حاصل کی جائے اور ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ بائیں بازو کے ان جانے پہچانے طریقوں کا استعمال عوام کے لیے معمول نہ بن جائے۔ اس حل کی تلاش ظاہر ہے مذاکرات میں آسانی سے کی جا سکتی تھی۔

صدر ایوب اور ان کے حامی طبقے کو بھی کسی نہ کسی مفاہمت پر پہنچنے کی جلدی ہے۔ صدر ایوب اور ان کے مشیروں کو اب اس چیز کا واضح احساس ہو چکا ہے کہ حالات کی خرابی کو موجودہ نہج تک پہنچانے کا ایک بنیادی سبب بعد از وقت اقدامات کرنا ہے۔ صدر ایوب نے اپنی ڈھاکہ والی تقریر میں اس کا برملا اعتراف کیا تھا کہ ملک کے بعض سیاسی مسائل حل طلب ہیں جس سے لوگوں میں مایوسی اور اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً انہوں نے مانا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بجا طور پر شکایت ہے کہ وہ ملک کے نظم و نسق چلانے میں برابر کے شریک نہیں۔ صدر صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو اس احساس نے پریشان کر رکھا ہے کہ انہیں ملکی حکومت چننے میں ووٹ دینے کا حق نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں سیاسی مسائل ایکا ایکی پیدا نہیں ہو گئے۔ یہ مسائل شروع ہی سے موجود تھے اور شروع سے ہی جمہوریت پسند لوگوں نے بار بار اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بیسیوں بیانات اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے برسرِ اقتدار گروہ کو ہمیشہ وارننگ دی کہ یہ مسائل بڑے بنیادی ہیں اور اگر بروقت اقدامات نہ کیے گئے تو نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے لیکن اقتدار اور وُہ بھی مطلق اقتدار کے نشے میں بدمست لوگوں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ان مسائل کے وجود سے انکار کیا گیا اور دردمند محبِ وطن نقادوں کو انتشار پسند اور غدار کہہ کر پسِ دیوارِ زنداں بھیج دیا گیا۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور لوگ اس حکومت اور اس نظامِ حکومت کے خلاف انتہا پسند طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تو پھر قدم بقدم پسپائی اختیار کرنے کو اپنایا گیا۔ جب عوام کی تحریک بگولوں کی طرح اُٹھی اور گھٹاؤں کی طرح ہر سمت چھا گئی تو اب صدر صاحب اور ان کے حواریوں کو شدید احساس ہُوا کہ وقت انہیں بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے حالات کے الجھاؤ میں ایک گرہ اور بڑھاتا جا رہا ہے۔ مفاہمت میں جتنی دیر ہوگی حالات ان کے قابو سے باہر ہوتے جائیں گے۔

صدر صاحب نے اپنے بعد از وقت اقدامات سے خود اپنے آپ کو کس قدر ناقابلِ رشک حالات میں پھنسا لیا ہے اور آنے والے واقعات کا اندازہ انہوں نے کتنا غلط کیا اس کی ایک چھوٹی سی مثال ان کی وہ تقریر ہو سکتی ہے جو انہوں نے صرف دو ماہ پیشتر اپنی جماعت کے عہدیداروں کو خطاب کرتے ہوئے لاہور میں کی تھی۔ اس تقریر کا لب و لہجہ اور نفسِ مضمون ہمیشہ کی طرح وہی تھا کہ ہمارا نظامِ حکومت مستحکم اور مضبوط ہے اور کسی بھی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ دس سالہ اصلاحات و ترقی کے حاصل کو بگاڑنے کی کوشش کرے اور یہ کہ حکومت اتنی مضبوط ہے کہ وہ اپنے شاندار کارناموں کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اب آپ ان خیالات کا موازنہ صدر صاحب کے

ساھیوال میں بیگم نصرت بھٹو، راؤ خورشید علی، طالب علم حبیب اللہ شاکر

حالیہ فرمودات اور اقدامات سے کیجیے۔ کوئی بھی ہوشمند انسان یہ سمجھنے میں مشکل محسوس نہیں کرے گا کہ اگر آج سے صرف دو مہینے پہلے تک بھی آمرانہ نظام حکومت کی خامیوں کا احساس کر لیا جاتا اور بادلوں میں اڑنے کے بجائے خاک نشینوں کی بات سُن لی جاتی تو حالات اتنے خراب نہ ہوئے ہوتے اور صدر صاحب کی موجودہ پریشانیوں میں سے بہت سی ابھی پیدا نہ ہوئی ہوتیں۔ بہرحال موجودہ حکومت نے خود ہی گڑھے کھودے اور پھر انتظار کرتی رہی کہ وقت کی بے پناہ تندی ان کے پھیلاؤ اور گہرائی میں اضافہ کرتی جائے۔ آج جب یہ پھیلاؤ ناقابلِ عبور ہو گئے ہیں تو حکومت گزرے وقتوں کی تلافی جلد بازی سے کرنے پر مجبور ہے۔

دائیں بازو کی قیادت اور موجودہ حکومت دونوں عوامی قوتوں سے خائف ہو کر مفاہمت کرنے کی جلدی میں ہیں کیونکہ دونوں کا اندازہ یہ ہے کہ بات اسی حد تک بڑھی ہے کہ سیاسی مسائل کے حل کا نعرہ لگا کر اگر عوام کو چند کھلونے دے دیے جائیں تو وہ بہل جائیں گے۔ حالانکہ اس وقت بھی دُور اندیش نگاہیں پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے اقتصادی مسائل کے دُور رس مضمرات کو دیکھ رہی ہیں اور بار بار تنبیہہ کر رہی ہیں کہ نوشتۂ دیوار کو پڑھو۔ معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کے سوا اب انسانیت کا وقار قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ جس جس کا حق غصب کیا ہے اسے لوٹا دو اور انسانی محنت کے استحصال سے باز آجاؤ۔ سرمایہ اور محنت کا پرامن حل یہی ہے کہ اسلامی عدل و مساوات کے اصولوں کو اپنا لو اور پرامن طریقے سے ایک مساواتی سلطنت قائم کر لو۔ ایسا کرنے کے لیے ابھی وقت باقی ہے۔ اس کی راہیں مسدود نہیں ہوئیں۔ عوام کی معاشی ابتری انتہا کو پہنچتی جا رہی ہے۔ غربت افلاس اور جہالت کا عفریت اس قوم کو نگلتا جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ لوٹ کھسوٹ کی پالیسی ختم کر دو۔ سرمایہ کے حریص گروہ پر قدغن لگا دو۔ پیداوار کے ذرائع کو اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے کھلا چھوڑ دو۔ ورنہ وہ وقت بھی دُور نہیں رہ سکتا جب اصلاحِ احوال کے سارے دروازے بند ہو چکے ہوں گے اور معاشی اقتدار پر قابض گروہ گزرے وقت کی تلافی کے لیے ایک دفعہ پھر جلد از جلد مفاہمت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو گا لیکن وقت اتنا آگے بڑھ چکا ہو گا کہ پھر مفاہمت یا بقائے باہم ناممکن ہو گی اور پھر وہی ہو گا جو تاریخی ارتقاء کے اصول مقرر کر چکے ہیں — غریبوں کا ہاتھ امیروں کے گریبان پر ہو گا۔

رات کا سورج

نئے دور کا نیا ناول

انور غالب

اس ناول کے بارے میں مدیر نصرت محمد حنیف رامے لکھتے ہیں :

"رات کا سورج" اردو ادب کے ترسے ہوئے آفاق پر بارش کے پہلے قطرے کی طرح نازل ہوا ہے۔ ڈوبتی روحوں، درماندہ زندگیوں، پریشان وجودوں، بھٹکتی آرزوؤں کے جہان میں ایک نفس چار سُو بکھری ہوئی حقیقت کے دل کی جانب پرواز کے لیے پَر تولتا ہے اور ایک کنوارے سفر کی تنہائیوں، گیرائیوں اور پہنائیوں میں غوطہ زن ہو جاتا ہے اور یوں انور غالب کے افقِ ہوش پر اس کہانی کا چاند طلوع ہوتا ہے۔

یہ کہانی انسانی روح کی دردانجامی کا ایک سراپا ہے اور ساتھ ہی زمان و مکان میں اسیر انسان کے امکانات کی ایک بصیرت۔ اس کے تار و پود میں رنگ، خوشبو اور دھوپ، چاندنی، ہوا کے گجرے گندھے ہیں۔ اس کے آئینے میں کتنی ہی دنیائیں مٹتی اور کتنی ہی دنیائیں صفحۂ عالم پر ابھرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے تناظر میں انسانی رشتوں کی رگوں میں مقدر کی سنسنی کا لہو لہریں لیتا محسوس ہوتا ہے۔

جس طرح کیدارا راگ انتظار کی ٹھنڈی آگ میں سلگتا اور یاس کو امید کی شکل دیتا ہے "رات کا سورج" ہمیں موت کے ظلمات سے گزار کر زندگی کے نور سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ موت کا ایک ذائقہ ہے جس کے بعد انسان میں زندگی کی حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی شکتی پیدا ہوتی ہے۔

انور غالب کا طرزِ احساس تجزیاتی نہیں وجدانی ہے، وہ ایک ایسے افقِ اعلیٰ سے انسانی تجربے پر نگاہ کرتی ہیں جہاں جسم، دل، دماغ اور روح کی تفریق مٹ جاتی ہے اور انسان اور حقیقت کے درمیان چند کمانوں کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

قیمت : تین روپے

البیان، چوک انارکلی، لاہور

فقیر بخش بگٹی

زمینداری

یہ حقیقت اب محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد جو ملوکیت خلافت کے نام پر قائم ہوئی تھی اور جو آج بھی کم بیش اکثر مسلمان ممالک میں اپنی تمام تر خون آشامیوں اور ستم کاریوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں قائم ہے، اس کی بنیاد زمینداری پر تھی۔ اور یہ وہی زمینداری ہے جس کے تحت کروڑوں عوام اپنی جانگسل محنت سے زمین کا سینہ چیر کر اناج کے جو وافر ذخائر پیدا کرتے ہیں اُن سے اُن کے اور اُن کے لواحقین کے لیے قوتِ لایموت اور دوا دوا غلامی اور احتیاج کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہزار عین نہ صرف زمینداروں کے محلوں، ان کی عیش سامانیوں اور انسانیت کش بے راہ رویوں کا سامان فراہم کرتے ہیں، بلکہ ان ممالک کے جملہ باشندوں کی بقائے حیات فلہٰذا سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی ضروریاتِ زندگی کے واحد کفیل بھی ہیں۔ ایک طرف یہ محنت کار اور خود بھوکوں مرنے والے مزارع ہیں جن کی اپنی اتنی زمین بھی نہیں ہوتی جس پر وہ اپنی جھونپڑیوں کو کھڑا کر کے اُن کے مالک بنیں اور دوسری طرف وہ مٹھی بھر زمیندار ہیں جن کے قبضے میں ارضِ الٰہی کا تقریباً تیسرا حصہ ہے۔ اس حساب سے مسلمان ممالک میں اوسطاً ہر زمیندار ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ یہ لوگ خود کوئی بھی کام نہیں کرتے، دوسروں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔

زمینداری کی اس ہیئت اور صورتِ حال سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا جس "مات" کی کارکن اکثریتِ عظیم اپنی محنت سے محروم، نانِ شبینہ کی محتاج اور حیوانی زندگی سے ہم آغوش ہو اور غاصبین کو دُنیا جہاں کی ساری آسائشیں خود کام کیے بغیر حاصل ہوں۔ اُس کے ایسے نظامِ زندگی کو مجسمۂ ظلم کے سوا کوئی دوسرا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس صریح اور ناقابلِ تردید عریاں ظلم کو گذشتہ تیرہ صدیوں سے ہمارے اجارہ دارانِ شرعِ متین" اسلامی نظام" کا نام دیتے چلے آرہے ہیں۔ یہ صرف عہدِ پارینہ کی باتیں نہیں ہیں بلکہ آج مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنے زعم میں اسلام کی واحد شارح ہونے کی مدعی جماعت اسلامی کا بھی فیصلہ اور فتویٰ ہے کہ اسلام میں بے حد و حساب زمینداری پر کوئی قید نہیں ہے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک اسلام کا دوسرا نام، مگر ماطل نظاموں کے ساتھ ساتھ زمینداری ہے۔ چونکہ حقائق بالا کے مطابق عمل بدترین ظلم ہے اس لیے اگر اسلام کی حقیقت وہی کچھ مانی جائے جو باعث یہاں پیش کر رہی ہے تو ایک سلیم العقل انسان کے نزدیک اسلام کے معنی ظلم کے ماسوا کچھ بھی نہیں ہو سکتے! ایک اسلام تو یہی ہے جسے ملوک و ملاکی ملی بھگت نے مسلمانوں کے خون کے آخری قطرے تک کو نچوڑنے کے لیے آج تک اپنے مفاد میں جبر و فریب سے جاری رکھا اور جس کے باعث ہر سلیم العقل انسان، چاہے مسلمان ہو یا غیر، اسلام ہی سے متنفر اور بیزار ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر اس کے برعکس، دوسرا اسلام، حقیقی اسلام، وہ ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ لہٰذا آیئے دیکھیں کہ قرآن کا اندریں بارہ فیصلہ کیا ہے؟

زمین کے وارث صالح بندے ہیں

زمین کے بارے میں قرآنِ حکیم کا رہنما اصول اور حتمی فیصلہ یہ ہے:-

"اور ہم نے زبور میں تمام نظائر و شواہد کو پیش کر کے بتاکید یہ حکم دیا تھا کہ زمین کے بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اس کی وراثت کا حق (صرف اور صرف) ہمارے صالح بندوں کو حاصل ہے۔" (۲۱/۱۰۵)

اس آیت میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انسان یکے بعد دیگرے، اُس کے وارث ہوتے ہیں اور اس وراثت کی شرط صالحیت و صلاحیت ہے۔ ان امور کی رُو سے وراثت اور صالحیت و صلاحیت ہی وہ دو شرائط ہیں جن کو اگر قرآن سے متعین کیا جائے تو زمین اور "زمینداری" کے بارے میں تمام جھگڑا انجیر و خوبی طے ہو سکتا ہے۔ جنت کے بارے میں قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ تمہی وہ الجنۃ ہے جس کے وارث ہمارے بندوں سے متقی ہوتے ہیں (۱۹/۱۶۳)۔ ظاہر ہے الجنۃ کسی کی ایسی ملکیت نہیں ہے جو باپ کے بعد خود بخود، بطور استحقاق بیٹے کو منتقل ہو۔ بلکہ جنت صرف اور صرف اس کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی زندگی قانونِ الٰہی کے مطابق گذارتا ہے اور جسے قرآن نے اتقا کہا ہے۔ ان دونوں آیتوں (۱۹/۱۶۳) اور (۲۱/۱۰۵) میں جو الفاظ آتے ہیں اُن کا مادہ "ورث" ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زمین اور جنت، دونوں یکساں طور پر وراثت میں آتی ہیں۔ مگر ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جنت اعمالِ صالحات کی بنا پر ملتی ہے یہ کسی کو اس لیے نہیں ملتی کہ اس کا باپ جنتی ہے۔ لہٰذا اگر جنت کے بارے میں قرآنی اصول، دربارۂ وراثت عملی ہے تو لامحالہ زمین کی وراثت کا اصول بھی صرف اور صرف عمل ہی ہو سکتا ہے جسے قرآن نے صالحیت و صلاحیت سے منسوب کیا ہے۔ صالح کے لغوی معانی سے قطع نظر، اسے خود قرآن نے صحیح و سالم اور

سیاسی لیڈر یا عوام

نیوز ویک ۱۰ فروری ۱۹۶۹ء

جنرل محمد ایوب کے دس سالہ دورِ حکومت کو اکثر اوقات ترقی پذیر ممالک میں ایک مثالی حکومت کی حیثیت دی گئی ہے اس دور میں پاکستانیوں نے ملک کی ترقی کے لیے ہر طرح تندہی، اعلیٰ کارکردگی اور توجہ سے کام کیا ہے۔ یہ ترقی ایک شاندار کہانی تھی۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء تک کے عرصے میں قومی پیداوار میں ۵۵ فیصد اضافہ ہوا۔ چھوٹی صنعتی پیداوار میں بھی ملک خود کفیل ہو گیا۔ آبپاشی اور اچھے بیج کے استعمال سے اس سال زرعی پیداوار میں ۲۳ فیصد اضافہ ہوا اور پاکستان جو ہر سال بیس لاکھ ٹن گندم درآمد کرتا تھا، چند سالوں میں خوراک کے لحاظ سے بھی خود کفیل ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔

صدر ایوب کے دشمن بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ترقی صدر کے پدرانہ طرزِ حکومت کا نتیجہ ہے۔ سینڈھرسٹ کا تعلیم یافتہ یہ فوجی افسر اعلیٰ کارکردگی کو انسان کی سب سے بڑی خوبی سمجھتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ پارلیمانی طرزِ حکومت ناکارکردگی کا مرقع ہے۔ نتیجے کے طور پر پاکستانی عوام یہ محسوس کرنے لگے کہ اعلیٰ کارکردگی محض ایک دھوکا ہے اور اس لفظ کے خول میں پاکستانی عوام کو فوجی انداز کے شکنجے میں کس کر رکھ دیا گیا ہے۔

پچھلے ہفتے مایوسی اور بیزاری کا طوفان ابل پڑا۔ ایسے ہنگامے پیا ہوئے کہ پاکستان کی تاریخ میں ایسے زبردست ہنگامے کبھی نہیں ہوئے۔ ننگے پاؤں، ہاتھوں میں اینٹ یا پتھر اٹھائے ہوئے ہجوم نے کراچی کی زندگی کو معطل کر دیا۔ مایوس عوام نے ان تاجروں کی دکانیں بھی جلا ڈالیں جو عوام کی ہمدردی میں دکانیں بند نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ عوام نے گورنمنٹ پارٹی کے ایک لیڈر کے گھر کو نذرِ آتش کیا تو اس ہجوم کو پندرہ ٹرک فوج بمشکل تمام ہٹا سکی۔ انگریزی طرز کی ڈنڈوں سے لیس پولیس کی مدد سے شہری نظام دوبارہ بحال کیا گیا۔ کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی پچاس ہزار کا ہجوم ایوب..... ہائے ہائے چلا چلا کر ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں اور نیم برہنہ رکشا ڈرائیوروں نے جن کے پاس اینٹ پتھر کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ تھا۔ فوج کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ ایک ہفتے کے ہنگاموں کا نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں مارشل لاء تھا اور ہزاروں لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں کوئی تیس کے قریب مظاہرین مارے گئے تھے۔

پاکستان کے اس پنجہ استحکام کے خلاف بہت سی شکایات ہیں۔ مشرقی پاکستان کی دیہاتی آبادی غربت کا شکار ہے۔ ان کا خیال ہے ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد ایوب گورنمنٹ نے کارخانوں کی طرف توجہ دی ہے اور کاشتکاری اور تعلیم کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ شہروں کو گلہ ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام نے پریس اور قانون تک کو مجوس کر دیا ہے۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کی بدولت ہی الیکشن کے نتائج توڑ مروڑ کر حکومت کی مرضی کے مطابق نتائج کا اعلان کیا جاتا ہے۔ طلباء کو یہ بھی گلہ ہے کہ اس نظام کے تحت اگر وہ کسی سیاسی نوعیت کے کام میں حصہ لیں جو موجودہ گورنمنٹ کی مرضی کے خلاف ہے تو ان کی ڈگریاں چھینی جا سکتی ہیں۔ قصہ مختصر عوام کی مرضی ایک شخص کی مرضی کی تابع ہو کر رہ گئی ہے۔

صدر ایوب کی بیماری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ بیماری سے اُٹھنے کے بعد انھوں نے ریاست کے بہت سے اُمور کو انتظامیہ کے فیصلوں پر چھوڑ دیا۔ پچھلے چند سالوں میں وہی رشوت اور بدعنوانی جس کے خلاف نظامِ حکومت تبدیل کیا گیا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر چکی ہے اگرچہ صدر کی ذات پر شبہ کم ہے مگر اس بات کا چرچا ہے کہ ان کا بیٹا گوہر ایوب وہ ہستی ہے جس کی وساطت سے سیاسی رعایتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کراچی کے محل میں جس میں تیرنے کے لیے مرمریں تالاب بنے ہوئے ہیں، گوہر ایوب ہفتے میں دو دفعہ ذاتی کچہری لگاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک کپتان ریٹائر ہونے کے بعد کروڑوں کے کاروبار کا مالک کیسے بن گیا۔

اس مایوسی اور بیزاری کا پہلا نشان تو پشاور میں صدر پر گولی چلانے کا واقعہ تھا۔ صدر کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ مگر اس کے جواب میں سیاسی لیڈروں کو عوام کو تشدد پر اکسانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں چالیس سالہ چین کا حامی ذوالفقار علی بھٹو بائیں بازو کی جماعتوں کا شہید تشدد بن گیا۔ بھٹو کی گرفتاری ایک غلطی تھی۔ اس عمل نے ایئر مارشل اصغر خاں کو میدانِ سیاست میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اصغر کی ایک تقریر میں اس نے جمہوریت کی حمایت میں مبہم سا بیان دیا تھا۔ پھولوں کی بارش کا پیش خیمہ بن گئی۔ چند ہفتوں بعد اس کا رویہ سخت ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ایوب بدعنوانی، کنبہ پروری اور نااہلی کا نمائندہ ہے۔ اگر وہ قائم رہتا ہے تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس کو حکومت سے الگ ہو جانا چاہیے۔

ان حالات کے پیشِ نظر صدر ایوب نے مصلحت پسندی کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ سیاسی لیڈروں نے گفت و شنید کے لیے کانفرنس کا اعلان کیا ہے۔ صدر ایوب کو امید ہے کہ اس طرح وہ ملک کی سیاسی زندگی میں کچھ آزادی دے کر اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیں گے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسے نیم دلانہ اقدامات عوام کی تسلی کا باعث ہوتے ہیں یا نہیں۔ کراچی میں ایک ڈاڑھی والے آدمی نے نیوز ویک کے نمائندے کو بتایا کہ ایوب کو صرف سیاسی لیڈروں کو خوش نہیں کرنا عوام کے مطالبات ماننے ہیں، ہمارے مطالبات، عوام کے مطالبات۔

معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کے سوا....

جمہوری مجلسِ عمل نے سیاسی مسائل کے حل کے لیے صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کی دعوت اصولاً قبول کر لی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے مسئلے پر تعطل اس اصول پر اثر انداز نہیں ہوا۔ یہ فیصلہ خلاف توقع نہیں۔ پچھلے چند دنوں سے سیاسی حالات میں یکے بعد دیگرے جو تبدیلیاں آئیں ان کا منطقی نتیجہ مذاکرات کی دعوت قبول کر لینا ہی تھا۔ جمہوری مجلسِ عمل میں شامل جماعتوں کی اکثریت اپنے مزاج کے اعتبار سے زیادہ دیر تک کھلی کھلی عوامی تحریک کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں اس چیز کا احساس ہے کہ قوم کا ہر طبقہ اگر موجودہ حکومت کے خلاف انقلابی بغاوت کا پرچم لے کر باہر نکل آیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ عوام کو سیاسی جمہوریت کے تصور میں اتنی کشش نظر آئی کہ وہ خاک و خون کی گلرنگ وادیوں سے گزر گئے بلکہ اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ عوام کی وسیع معاشی و معاشرتی مشکلات نے مایوسی اور نا امیدی کی وہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ طوفان کا اُٹھنا مقدر ہو چکا تھا۔ یہ تحریک تو حالات کی تاریکی میں نشو و نما پا رہی تھی صرف اس طوفان کو پھوٹ بہنے کے لیے حالات کی سازگاری کا انتظار تھا۔ وہ حالات جمہوری مجلسِ عمل کے پیدا کردہ نہیں تھے لیکن یہ بات ضرور تسلیم کرنی ہوگی کہ مجلسِ عمل کی کارگزاری نے ان حالات کو متاثر ضرور کیا ہے۔ حالات کو متاثر کرنے کی قوت بھی اگرچہ اہم بات ہے لیکن بنیادی حالات کا رُخ متعین کرنے کی صلاحیت ہے۔ مجلسِ عمل کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہے کہ تحریک کا تسلسل حالات کو جس سمت میں لے جائے گا، اس پر انہیں کوئی قابو حاصل نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ یا تو اس کے جوش و خروش کو تھوڑا سا کم کر دیں یا کسی منزل پر کچھ تیز کر دیں۔ اس سے بڑھ کر اس کے رُخ کو بدلنا یا اس پر بند باندھنا ان کے بس کی بات نہیں۔

دائیں بازو کی جماعتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے عوامی تحریکوں کی آگ کا ایندھن فراہم نہیں کیا کرتیں لیکن ہمارے ہاں بعض مخصوص حالات کی مجبوریوں نے بات یہاں تک پہنچا دی کہ ان دائیں بازو کی جماعتوں کو وہی طریقِ کار اختیار کرنا پڑا جو عموماً بائیں بازو کی جماعتوں سے مخصوص ہے۔ ۱۴ فروری کی ملک گیر ہڑتال اس کی واضح مثال ہے۔ اس ہڑتال کی کامیابی پر کوئی بھی جماعت خود کو مبارک باد دے سکتی ہے لیکن اس ہڑتال کی کامیابی ہی نے جمہوری مجلسِ عمل کے اس احساس کو اور بھی شدید کر دیا ہے کہ حالات کا دھارا جس رُخ پہ بہہ رہا ہے اسے اگر منطقی نتیجے تک پہنچ جانے دیا گیا تو وہ منزل خود ان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی اس لیے ضروری ہے کہ مظاہروں اور ہڑتالوں سے نجات حاصل کی جائے اور ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ بائیں بازو کے ان جانے پہچانے طریقوں کا استعمال عوام کے لیے معمول نہ بن جائے۔ اس حل کی تلاش ظاہر ہے مذاکرات میں آسانی سے کی جا سکتی تھی۔

صدر ایوب اور ان کے حامی طبقے کو بھی کسی نہ کسی مفاہمت پر پہنچنے کی جلدی ہے۔ صدر ایوب اور ان کے مشیروں کو اب اس چیز کا واضح احساس ہو چکا ہے کہ حالات کی خرابی کو موجودہ نہج تک پہنچانے کا ایک بنیادی سبب بعد از وقت اقدامات کرنا ہے۔ صدر ایوب نے اپنی ڈھاکہ والی تقریر میں اس کا برملا اعتراف کیا تھا کہ ملک کے بعض سیاسی مسائل حل طلب ہیں جس سے لوگوں میں مایوسی اور اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً انہوں نے مانا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بجا طور پر شکایت ہے کہ وہ ملک کے نظم و نسق چلانے میں برابر کے شریک نہیں۔ صدر صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو اس احساس نے پریشان کر رکھا ہے کہ انہیں ملکی حکومت چلنے میں ووٹ دینے کا حق نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں سیاسی مسائل ایکا ایکی پیدا نہیں ہو گئے۔ یہ مسائل شروع ہی سے موجود تھے اور شروع سے ہی جمہوریت پسند لوگوں نے بار بار اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بیسیوں بیانات اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے برسرِ اقتدار گروہ کو ہمیشہ وارننگ دی کہ یہ مسائل بڑے بنیادی ہیں اور اگر بروقت اقدامات نہ کیے گئے تو نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے لیکن اقتدار اور وہ بھی مطلق اقتدار کے نشے میں بدمست لوگوں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ان مسائل کے وجود سے انکار کیا گیا اور دردمند محبِ وطن نقادوں کو انتشار پسند اور غدار کہہ کر پسِ دیوارِ زنداں بھیج دیا گیا۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور لوگ اس حکومت اور اس نظامِ حکومت کے خلاف انتہا پسند طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تو پھر قدم بقدم پسپائی اختیار کرنے کو اپنایا گیا۔ جب عوام کی تحریک جنگلوں کی طرح اُمڈی اور گھٹاؤں کی طرح ہر سمت چھا گئی تو اب صدر صاحب اور ان کے حواریوں کو شدید احساس ہوا کہ وقت انہیں بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے حالات کے الجھاؤ میں ایک گرہ اور بڑھاتا جا رہا ہے۔ مفاہمت میں جتنی دیر ہوگی حالات ان کے قابو سے باہر ہوتے جائیں گے۔

صدر صاحب نے اپنے بعد از وقت اقدامات سے خود اپنے آپ کو کس قدر ناقابلِ رشک حالات میں پھنسا لیا ہے اور آنے والے واقعات کا اندازہ انہوں نے کتنا غلط کیا اس کی ایک چھوٹی سی مثال ان کی وہ تقریر ہو سکتی ہے جو انہوں نے صرف دو ماہ پیشتر اپنی جماعت کے عہدیداروں کو خطاب کرتے ہوئے لاہور میں کی تھی۔ اس تقریر کا لب و لہجہ اور نفسِ مضمون ہمیشہ کی طرح وہی تھا کہ ہمارا نظامِ حکومت مستحکم اور مضبوط ہے اور کسی بھی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ دس سالہ اصلاحات و ترقی کے حاصل کو بگاڑنے کی کوشش کرے اور یہ کہ حکومت اتنی مضبوط ہے کہ وہ اپنے شاندار کارناموں کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اب آپ ان خیالات کا موازنہ صدر صاحب کے

ساھیوال میں بیگم نصرت بھٹو، راؤ خورشید علی، طالب علم حبیب اللہ شاکر

حالیہ فرمودات اور اقدامات سے کیجیے۔ کوئی بھی ہوشمند انسان یہ سمجھنے میں مشکل محسوس نہیں کرے گا کہ اگر آج سے صرف دو مہینے پہلے تک بھی آمرانہ نظام حکومت کی خامیوں کا احساس کر لیا جاتا اور بادلوں میں اڑنے کے بجائے خاک نشینوں کی بات سُن لی جاتی تو حالات اتنے خراب نہ ہوئے ہوتے اور صدر صاحب کی موجودہ پریشانیوں میں سے بہت سی ابھی پیدا نہ ہُوئی ہوتیں۔ بہرحال موجودہ حکومت نے خود ہی گڑھے کھودے اور پھر انتظار کرتی رہی کہ وقت کی بے پناہ تندی ان کے پھیلاؤ اور گہرائی میں اضافہ کرتی جائے۔ آج جب یہ پھیلاؤ ناقابلِ عبور ہو گئے ہیں تو حکومت گزرے وقتوں کی تلافی جلد بازی سے کرنے پر مجبور ہے۔

دائیں بازو کی قیادت اور موجودہ حکومت دونوں عوامی قوتوں سے خائف ہو کر مفاہمت کرنے کی جلدی میں ہیں کیونکہ دونوں کا اندازہ یہ ہے کہ بات اسی حد تک بڑھی ہے کہ سیاسی مسائل کے حل کا نعرہ لگا کر اگر عوام کو چند کھلونے دے دیے جائیں تو وہ بہل جائیں گے۔ حالانکہ اس وقت بھی دُور اندیش نگاہیں پردوں کے پیچھے چھپے ہُوئے اقتصادی مسائل کے دُور رس مضمرات کو دیکھ رہی ہیں اور بار بار تنبیہہ کر رہی ہیں کہ نوشتۂ دیوار کو پڑھو۔ معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کے سوا اب انسانیت کا وقار قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ جس جس کا حق غصب کیا ہے اسے لوٹا دو اور انسانی محنت کے استحصال سے باز آجاؤ۔ سرمایہ اور محنت کا پر امن حل یہی ہے کہ اسلامی عدل و مساوات کے اصُولوں کو اپنا لو اور پر امن طریقے سے ایک مساواتی سلطنت قائم کر لو۔ ایسا کرنے کے لیے ابھی وقت باقی ہے۔ اس کی راہیں مسدُود نہیں ہوئیں عوام کی معاشی ابتری انتہا کو پہنچتی جا رہی ہے۔ غربت افلاس اور جہالت کا عفریت اس قوم کو نگلتا جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ لُوٹ کھسُوٹ کی پالیسی ختم کر دو۔ سرمایہ کے حریص گردہ پر قدغن لگا دو۔ پیداوار کے ذرائع کو اجتماعی فلاح و بہبُود کے لیے کھلا چھوڑ دو۔ ورنہ وہ وقت بھی دُور نہیں رہ سکتا جب اصلاحِ احوال کے سارے دروازے بند ہو چکے ہوں گے اور معاشی اقتدار پر قابض گروہ گزرے وقت کی تلافی کے لیے ایک دفعہ پھر جلد از جلد مفاہمت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو گا لیکن وقت اتنا آگے بڑھ چکا ہو گا کہ پھر مفاہمت یا بقائے باہم ناممکن ہو گی اور پھر وہی ہو گا جو تاریخی ارتقاء کے اصول مقرر کر چکے ہیں ــــ غریبوں کا ہاتھ امیروں کے گریبان پر ہو گا۔

رات کا سورج

نئے دور کا نیا ناول

انور غالب

اس ناول کے بارے میں مدیر نصرت محمد حنیف رامے لکھتے ہیں :

"رات کا سورج" اردو ادب کے ترسے ہوئے آفاق پر بارش کے پہلے قطرے کی طرح نازل ہوا ہے۔ ڈوبتی روحوں، درماندہ زندگیوں، پریشان وجودوں، بھٹکتی آرزوؤں کے جہان میں ایک نفس چار سُو بکھری ہوئی حقیقت کے دل کی جانب پرواز کے لیے پَر تولتا ہے اور ایک کنوارے سفر کی تنہائیوں، گیرائیوں اور پہنائیوں میں غوطہ زن ہو جاتا ہے اور یوں انور غالب کے افقِ ہوش پر اس کہانی کا چاند طلوع ہوتا ہے۔

یہ کہانی انسانی روح کی درد انجامی کا ایک سراپا ہے اور ساتھ ہی زمان و مکان میں اسیر انسان کے امکانات کی ایک بصیرت۔ اس کے تار و پود میں رنگ، خوشبو اور دھوپ، چاندنی، ہوا کے گجرے گندھے ہیں۔ اس کے آئینے میں کتنی ہی دنیائیں مٹتی اور کتنی ہی دنیائیں صفحۂ عالم پر ابھرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے تناظر میں انسانی رشتوں کی رگوں میں منقدر کی سنگینی کا لہو لہریں لیتا محسوس ہوتا ہے۔

جس طرح کیدارا راگ انتظار کی ٹھنڈی آگ میں سلگتا اور یاس کو امید کی شکل دیتا ہے "رات کا سورج" ہمیں موت کے ظلمات سے گزار کر زندگی کے نور سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ موت کا ایک ذائقہ ہے جس کے بعد انسان میں زندگی کی حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی شکتی پیدا ہوتی ہے۔

انور غالب کا طرزِ احساس تجرباتی نہیں وجدانی ہے، وہ ایک ایسے افقِ اعلیٰ سے انسانی تجربے پر نگاہ کرتی ہیں جہاں جسم، دل، دماغ اور روح کی تفریق مٹ جاتی ہے اور انسان اور حقیقت کے درمیان چند کمانوں کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔

قیمت : تین روپے

البیان، چوک انارکلی، لاہور

فقیر بخش بگٹی

قرآن کا صفحہ

زمینداری

یہ حقیقت اب محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد جو ملوکیت خلافت کے نام پر قائم ہوئی تھی اور جو آج بھی کم بیش اکثر مسلمان ممالک میں اپنی تمام تر خون آشامیوں اور ستم کاریوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں قائم ہے، اس کی بنیاد زمینداری پر تھی۔ اور یہ وہی زمینداری ہے جس کے تحت کروڑوں عوام اپنی جانگسل محنت سے زمین کا سینہ چیر کر اناج کے جواہر ذخائر پیدا کرتے ہیں اُن سے اُن کے اور اُن کے لواحقین کے لیے قوتِ لایموت اور دوامی غلامی اور احتیاج کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ مزارعین نہ صرف زمینداروں کے محلوں، ان کی عیش سامانیوں اور انسانیت کش بے راہ رویوں کا سامان فراہم کرتے ہیں، بلکہ ان ممالک کے جملہ باشندوں کی بقائے حیات فلہٰذا سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی ضروریاتِ زندگی کے واحد کفیل بھی ہیں۔ ایک طرف یہ محنت کار اور خود بھوکوں مرنے والے مزارع ہیں جن کی اپنی اتنی زمین بھی نہیں ہوتی جس پر وہ اپنی جھونپڑیوں کو کھڑا کر کے اُن کے مالک بنیں اور دوسری طرف وہ مٹھی بھر زمیندار ہیں جن کے قبضے میں ارضِ الٰہی کا تقریباً تیسرا حصہ ہے۔ اس حساب سے مسلمان ممالک میں اوسطاً ہر زمیندار ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ یہ لوگ خود کوئی بھی کام نہیں کرتے، دوسروں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔

زمینداری کی اس ہیئت اور صورتِ حال سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا جس "امت" کی کارکن اکثریت عظیم اپنی محنت سے محروم، نانِ شبینہ کی محتاج اور حیوانی زندگی سے ہم آغوش ہو اور غاصبین کو دُنیا جہاں کی ساری آسائشیں خود کام کیے بغیر حاصل ہوں، اُس کے ایسے نظامِ زندگی کو مجسمۂ ظلم کے سوا کوئی دوسرا نام ہرگز ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس صریح اور ناقابلِ تردید عریاں ظلم کو گذشتہ تیرہ صدیوں سے ہمارے اجارہ دارانِ شرعِ متین" اسلامی نظام" کا نام دینے چلے آرہے ہیں۔ یہ صرف عہدِ پارینہ کی باتیں نہیں ہیں بلکہ آج مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنے زعم میں اسلام کی واحد شارح ہونے کی مدعی جماعت اسلامی کا بھی فیصلہ اور فتویٰ ہے کہ اسلام میں بے حد و حساب زمینداری پر کوئی قید نہیں ہے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک اسلام کا دوسرا نام، دیگر باطل نظاموں کے ساتھ ساتھ زمینداری ہے۔ چونکہ حقائق بالا کے مطابق زمینداری دراصل بدترین ظلم ہے اس لیے اگر اسلام کی حقیقت وہی کچھ مانی جائے جو یہ جماعت یہاں پیش کر رہی ہے تو ایک سلیم العقل انسان کے نزدیک اسلام کے معنی ظلم کے ماسوا کچھ بھی نہیں ہو سکتے! ایک اسلام تو یہی ہے جسے ملوک و ملاکی ملی بھگت نے مسلمانوں کے خون کے آخری قطرے تک کو نچوڑنے کے لیے آج تک اپنے مفاد میں جبر و فریب سے جاری رکھا اور جس کے باعث ہر سلیم العقل انسان، چاہے مسلمان ہو یا غیر، اسلام ہی سے متنفر اور بیزار ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر اس کے برعکس، دوسرا اسلام، حقیقی اسلام، وہ ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ لہٰذا آیئے دیکھیں کہ قرآن کا اندریں بارہ فیصلہ کیا ہے؟

زمین کے وارث صالح بندے ہیں

زمین کے بارے میں قرآن حکیم کا رہنما اصول اور حتمی فیصلہ یہ ہے:-

"اور ہم نے زبور میں تمام نظائر و شواہد کو پیش کر کے بتاکید یہ حکم دیا تھا کہ زمین کے بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اس کی وراثت کا حق (صرف اور صرف) ہمارے صالح بندوں کو حاصل ہے۔" (۲۱/۱۰۵)

اس آیت میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انسان یکے بعد دیگرے، اُس کے وارث ہوتے ہیں اور اس وراثت کی شرط صالحیت و صلاحیت ہے۔ ان امور کی رُو سے وراثت اور صالحیت و صلاحیت ہی وہ دو شرائط ہیں جن کو اگر قرآن سے متعین کیا جائے تو زمین اور "زمینداری" کے بارے میں تمام جھگڑا بخیر و خوبی طے ہو سکتا ہے۔ جنت کے بارے میں قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ تمہی وہ الجنۃ ہے جس کے وارث ہمارے بندوں سے متقی ہوتے ہیں (۱۹/۱۶۳)۔ ظاہر ہے الجنۃ کسی کی ایسی ملکیت نہیں ہے جو باپ کے بعد خود بخود، بطور استحقاق بیٹے کو منتقل ہو۔ بلکہ جنت صرف اور صرف اس کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی زندگی قانونِ الٰہی کے مطابق گذارتا ہے اور جسے قرآن نے اتقا کہا ہے۔ ان دونوں آیتوں (۱۹/۱۶۳) اور (۲۱/۱۰۵) میں جو الفاظ آتے ہیں اُن کا مادہ "ورث" ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زمین اور جنت، دونوں یکساں طور پر وراثت میں آتی ہیں۔ مگر ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جنت اعمالِ صالحات کی بنا پر ملتی ہے یہ کسی کو اس لیے نہیں ملتی کہ اس کا باپ جنتی ہے۔ لہٰذا اگر جنت کے بارے میں قرآنی اصول، دربارۂ وراثت عملی ہے تو لامحالہ زمین کی وراثت کا اصول بھی صرف اور صرف عمل ہی ہو سکتا ہے جسے قرآن نے صالحیت و صلاحیت سے منسوب کیا ہے۔ صالح کے لغوی معانی سے قطع نظر، اسے خود قرآن نے صحیح و سالم اور

تندرست کے معنوں میں استعمال کیا ہے (۷/۱۹۰) ان معانی سے بات خود بخود واضح ہو گئی اور وہ یوں کہ زمین کے وارث (نہ کہ مالک) صرف اور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو تندرست و تنومند اور اس پر کام کی مطلوبہ صحت کے حامل ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت اگر کسی ایسے شخص کو بقدر ضرورت زمین دی گئی تھی (۴/۱۱) اور بالفرض اس کی اولاد میں اس پر کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ زمین کسی اور ایسے شخص کو ملے گی جو اس پر کام کرنے کی صلاحیت اور مطلوبہ صحت سے مالا مال ہو۔ یہ ہے وراثتِ زمین کا قرآنی اصول جو وراثتِ جنت کے عین مطابق ہے!

غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ قرآن کا مندرجہ بالا اصول تخلیقِ زمین کے مدعا و مقصد کے عین مطابق ہے۔ قرآن کی رُو سے زمین کا مصرف، صرف یہ ہے کہ اس کو مستقر اور متاع کے طور پر کام میں لایا جائے (۲/۳۶) یہ انسان کے لیے سامانِ زیست اور ذریعۂ معاش ہے (۷/۱۰) ظاہر ہے زمین سے سامانِ زیست تب حاصل کیا جا سکتا ہے جب اُس پر کام کیا جائے اور کام صحت مند (صالح) افراد ہی کر سکتے ہیں جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہتے اور ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ بے کار لوگ زمین سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے اور اس لیے ان کو نہ تو زمین کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ "مالک"! دیکھیے کہ قرآن کا مذکورہ اصولِ وراثت اور یہ مدعا باہم کس قدر ہم آہنگ ہیں!! زمیندار طبقہ چونکہ بے کار (غیر صالح) ہوتا ہے اس لیے زمین پر اُس کا مالکانہ تصرف اور نظامِ زمینداری قرآنی اصولِ وراثتِ ارض اور صالحیت کے برعکس ہے۔

اُصولِ انبیاءؑ

اس کے علاوہ صالحیت کی حقیقت ایک اور نکتۂ نظر سے بھی قابلِ غور ہے۔ قرآن نے تقریباً تمام انبیاءؑ کو فرداً فرداً صالح کہا ہے۔ (مثلاً) حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ (۲۱/۷۲، ۷۳) حضرت لوطؑ (۲۱/۷۵) حضرت اسماعیلؑ حضرت ادریسؑ اور حضرت ذوالکفلؑ (۲۱/۸۵ و ۸۶) جملہ انبیاءؑ کے بارے میں یہ حقیقت ہر کسی کو معلوم ہے کہ کسی ایک نے بھی اپنے ہاں کی زمین (مُلک) یا اُس کے کسی حصّے پر نہ اپنی ملکیت قائم کی تھی، نہ زمیندار بنا تھا اور نہ ایسا حق ملکیت اپنی اولاد کو منتقل کیا تھا۔ آخری طور پر یہ حقیقت حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ سے بخوبی ثابت ہے۔ حضورؐ کی زندگی میں نہ صرف باغِ فدک آپؐ اور آپؐ کے لواحقین کے گذارے کے لیے آپؐ کو دیا گیا تھا۔ مگر حضورؐ کی وفات پر وہ باغ آپؐ کی اولاد کو نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے زمین اگر انبیاءؑ کی ملکیت نہیں ہو سکتی اور اس لیے اُن کی اولاد کو بھی منتقل نہیں ہوئی تو پھر انبیاءؑ کے متبعین ایسی ملکیت اور اس ملکیت کی بنا پر زمینداری کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس کا بھی یہ مطلب ہوا کہ صالحیت کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ زمین کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور جو لوگ اس پر اپنی ملکیت اور اس حق ملکیت کو اپنی اولاد کو منتقل کرنے کا رواج قائم کرتے ہیں وہ چاہے مسلمانی کے لاکھ دعوے کریں سنّتِ انبیاءؑ اور ضابطۂ الٰہی کی اطاعت سے بدیہی طور پر انکاری ہیں۔ اور احکامِ الٰہی سے انکار کرنے والوں ہی کو قرآن نے کافر قرار دیا ہے!

زمینداری قرآن کے منافی ہے

سطورِ بالا سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جملہ انبیاء صالح تھے۔ صحت مند اور تنومند تھے اور خود کام کرتے تھے۔ اور اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے عوض کسی اجر کے طالب نہ تھے۔ (مثلاً) حضرت ہودؑ (۲۶/۱۲۷) حضرت صالحؑ (۲۶/۱۴۵) حضرت لوطؑ (۲۶/۱۶۵) اور حضرت شعیبؑ (۲۶/۱۸۰) جب ایسے صالحینؑ خود کام کرتے تھے اور اپنے کام تک کے لیے کسی اجر کے طالب نہ ہوتے تھے تو زمینداروں کا بے کار طبقہ کس برتے پر دستکاروں کی محنت کو اپنا اجر قرار دینے میں حق بجانب ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے زمیندار غاصب ہیں اور زمینداری قرآنی اصول و حکمِ وراثتِ ارض کے سراسر منافی ہے! غرضیکہ ؎

باطنِ الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است (اقبالؒ)

یہ ہے وہ اسلامی نظام دربارۂ زمین جسے قرآن پیش کرتا ہے! اس کے مقابلے میں آج جماعتِ اسلامی "زمینداری، بے قید اور غیر محدود زمینداری کو اسلام قرار دے رہی ہے!! اگر اسلام سے مراد قرآن اور حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ ہے اور حضورؐ اور آپؐ کی اولاد اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ زمیندار نہیں تھے اور قرآن بھی زمینداری کو ممنوع قرار دیتا ہے تو یہ نظام بھی بلاشک و شبہ غیر اسلامی ہے۔ اور جب حقیقت یہی کچھ ہے تو جماعتِ اسلامی کی "حمایتِ زمینداری بھی غیر از اسلام نظامِ زندگی کی حمایت ہے نہ کہ اسلام کی! ایں مصطفےٰؐ کی حمایت نہیں ہے، بلکہ ابولہب کی حمایت ہے ؎

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است (اقبالؒ)

چیئرمین بھٹو کا

حلفی بیان

پمفلٹ کی صورت میں تیار ہے۔
قیمت بیس پیسے۔ دس سے زائد کی صورت میں پندرہ پیسے
ایک نسخہ بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے تیس پیسے کے ٹکٹ بھیجیں
البیان ۵ چوک انارکلی، لاہور

پاکستان پیپلز پارٹی کا حسب ذیل

لٹریچر تیار ہے

پاکستان کی سیاسی حالت — (اردو)	ایک روپیہ
پولیٹیکل سچوایشن اِن پاکستان — (انگریزی)	ایک روپیہ
بھٹو کہتا ہے	ایک روپیہ سو
مختصر پروگرام پیپلز پارٹی	دو روپیہ سو
پیپلز پارٹی کیوں بنائی گئی	دو روپیہ سو
چیئرمین بھٹو سے انٹرویو	پانچ روپیہ سو
میر رسول بخش تالپور سے انٹرویو	پانچ روپیہ سو
قائد اعظم کس طرح کا پاکستان چاہتے تھے	پانچ روپیہ سو
نظریۂ پاکستان	پانچ روپیہ سو
چیئرمین بھٹو کی تصویر ۲۰ × ۱۵	دس پیسے
ہم بھٹو کے ساتھ ہیں (کالر بیج)	چھ روپے ہزار
بھٹو کا حلفی بیان	بیس پیسے

ڈاک خرچ منگوانے والے کے ذمے ہوگا — سو سے کم اشتہار نہیں بھیجے جائیں گے۔

البیان چوک انارکلی لاہور

پاکستان کی عزت، عظمت اور غیرت کی آواز

ذوالفقار علی بھٹو

کے بارے میں دو کتابیں جو واقعی کتابیں ہیں

بھٹو کی سیاسی زندگی

چیئرمین بھٹو کی مجاہدانہ زندگی، عظیم سیاسی خدمات، قربانیوں اور قید و بند کی مفصل روداد

کلیم نشتر کے قلم سے — آفسٹ طباعت، سفید کاغذ، باتصویر۔ قیمت ۵/

چیئرمین بھٹو کے اقوال و افکار

بھٹو صاحب کی تعلیمات، نظریات، سیاسی افکار کا خلاصہ ہر قومی و بین الاقوامی مسئلہ پر ان کی حتمی اور قابل عمل رائے۔ جیبی سائز، خوبصورت جلد، آفسٹ طباعت۔ قیمت ۱/۵۰

مکتبہ عالیہ۔ ایبک روڈ۔ لاہور

اپنے شہر کے ہر اچھے بک سٹال سے خریدیں۔

جُنیدِ بغداد

مصنف :— ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر

صدر: شعبۂ دینیات، الازہر یونیورسٹی، مصر

مترجم :— محمد کاظم

★

حضرت جنیدؒ کا زمانہ تصوف کی تاریخ میں ابتلا اور بحران کا زمانہ تھا۔ بعض صوفیہ نے جب اپنے قول و عمل میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو انھیں بڑی کٹھن اور جان لیوا آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ ان حالات میں یہ حضرت جنیدؒ تھے جو ایک طرف اپنے صوفیانہ تجربے اور تعلیمات کو اس طور سے ضبط تحریر میں لائے کہ اس پر علماء اور اہلِ شریعت بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے، اور جنھوں نے دوسری طرف اس امر پر بھی زور دیا کہ تصوف ایک ایسا مخصوص اور ناقابلِ تفہیم روحانی تجربہ ہے کہ اس کی کیفیات عام لوگوں کے سامنے بیان کرنا ضروری ہے نہ جائز! حضرت جنیدؒ کے اس محتاط اور اعتدال پسندانہ رویے نے تصوف کے گرتے ہوئے وقار کو سہارا دیا اور تصوف کو تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک علمی اور عقلی بنیاد میسر آئی۔

ان وجوہ سے تصوف کے سلسلۂ نسب میں حضرت جنیدؒ کو ایک مورثِ اعلیٰ اور بانی مبانی کا مقام حاصل ہے اور صوفیہ کے ایک مجمع نے بجا طور پر انھیں "سیّد الطائفہ" (سردار جماعت صوفیہ) کا خطاب دیا تھا۔

حضرت جنیدؒ نے کس قسم کے ماحول میں پرورش پائی؟ کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو پہلے علوم دینی سے بہرہ ور کیا اور پھر تصوف کی جانب مائل ہوئے؟ ان کے صوفیانہ نظریات کیا تھے اور ان کا رشتہ کیونکر ایک طرف وحی قرآنی سے اور دوسری طرف نوفلاطونی تصورات کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے؟ پھر انھوں نے اپنے مکاتیب میں اپنے احباب اور رفقاء کے ساتھ تصوف کے کن مسائل پر، کیسے پیرائے میں، گفتگو کی ہے؟ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بہت کچھ، اس کتاب کا موضوع ہے!

اس کتاب میں بغداد کا عظیم مدرسۂ تصوف اپنے پورے منظر کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ قیمت : ۵ روپے

مکتبۂ جدید : ۴، شارع فاطمہ جناح، لاہور

فون : ۶۲۵۴۰

دلیل کا طمانچہ

اسلام کے اُن ٹھیکیداروں کے مُنہ پر

جو اسلام کے مقدّس نام پر

زمینداری اور جاگیرداری کا تحفظ اور سامراجی مقاصد کے فروغ کا سامان کر رہے ہیں

زمینداری، جاگیرداری اور اسلام

از: رحمت اللہ طارق

اس معرکۃ الآرا کتاب میں قرآن حکیم کی تعلیمات، نبی اکرمؐ کی سیرت، صحابہ کرامؓ کے وطیرے اور عظیم مسلمان مفکروں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام ایک انقلابی دین ہے جس نے امیر اور غریب میں مساوات قائم کی اور بلالِ حبشیؓ کو عثمان غنیؓ کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔

آج کی عوامی تحریک میں اس انقلاب آفریں کتاب کا مطالعہ

اسلام اور نظریۂ پاکستان کی رُوح کو سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے

- ایک کتاب جسے مُلک کے تمام عوام دوست حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔
- ایک کتاب جو مساوات کے لیے جدوجہد کرنے والے ہر سیاسی کارکن کے وردِ زباں ہونی چاہئے۔
- ایک کتاب جو پاکستان میں اقبالؒ، قائداعظم اور ذوالفقار علی بھٹو کی "اسلامی سوشلزم" کی تفسیر ہے۔

مجلد، سفید کاغذ، بڑا سائز
آفسٹ کی بے داغ طباعت
قیمت: آٹھ روپے

ستا ایڈیشن
پانچ روپے

البیان
چوک انارکلی، لاہور

ہفت روزہ نصرت لاہور ——— رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۴۸۷
صدر دفتر: چوک انارکلی، لاہور ——— فون : 66606
محمد حنیف رامے نے شیخ حامد محمود کے زیر اہتمام نوائے وقت پرنٹرز لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

امان اللہ خان ——— پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک جواں سال، جواں فکر، جواں ہمت رہنما